بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ

آل عمران : ۷

دروس القرآن الحکیم

شیخ الاسلام محقق العصر حضرۃ علامہ سید شمس الحق افغانی رحمہ اللہ

مرتبہ عبد الغنی عفا عنہ اللہ

جلد ششم

مکتبہ سید شمس الحق افغانی
شاہی بازار ، بہاولپور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

هو الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات

آل عمران : ۷

درس القرآن الحکیم

شیخ الاسلام محقق العصر حضرت علامہ سید شمس الحق افغانی

مرتبہ

عبد الغنی عفا اللہ عنہ

جلد ششم

مکتبہ شمس الحق افغانی

شاہی بازار ، بہاولپور

نام کتاب	دروس القرآن الحکیم جلد ششم
افادات	حضرت علامہ سید شمس الحق افغانیؒ
مرتبہ	عبدالغنی
مطبع	
قیمت	
کمپیوٹر کمپوزنگ	محمد ذکاء الحسن، بہاول پور
	موبائل: 0321-6804318

عرضِ حال

قارئین کرام! اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے (دروس القرآن الحکیم) جلد ششم کی اشاعت ہوچکی ہے جواس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

یہ جلد ششم بھی ۳۲ دروس پر مشتمل ہے۔اس میں مسئلہٗ تقدیر، تعریف نفاق، نفاق کے نقصانات اور منافقین کے نتائج پر دروس بیان کئے گئے ہیں ماشاء اللہ حضرت علامہ افغانیؒ نے عجیب وغریب عقلی ونقلی نکات بیان فرمائے ہیں۔

علماء کرام وطلباء صاحبان کو چاہیے کہ ان دروس کا خود بھی مطالعہ کریں اور احباب کو بھی مطالعہ کی ترغیب دیں۔

جزاکم اللہ

بندہ عبدالغنی عفااللہ عنہ

۵۔جون ۲۰۰۶ء

فہرست

درس نمبرا
12 جون 1966ء

اَسبابِ فلاَح

اس سے پہلے درس میں فلاح کی حقیقت پر کچھ بیان ہوا تھا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر فائدہ کا حاصل ہونا اور ہر ضرر سے محفوظ رہنا۔ یہ فلاح ہے تو ہر انسان کی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس دنیا میں یہ فلاح جو آرزوئے انسان ہے کسی انسان کو حاصل نہیں۔ اب اگر کسی اور مقام میں حاصل نہ ہو تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ انسان کی فطرت کی غلطی ہو گی۔ مگر انسان کی فطرت کی بات ہے کہ فلاح حاصل ہو جائے۔ تو معلوم ہو گیا کہ یہ عالمگیر تمنا غلط نہیں ہو سکتی۔ تو معلوم ہو گیا کہ جو زندگی موت کے بعد ہے اس میں فلاح ہے اب اس بات کا ازالہ کرتا ہوں کہ اس دنیا میں فلاح کو کیوں نہیں رکھا جواب یہ ہے کہ اس دنیا میں فلاح کی گنجائش نہیں۔ فلاح اتنی بڑی عظیم الشان نعمت ہے کہ دنیوی زندگی کے تنگ پیالہ کے اندر نہیں آ سکتی یہ ایسے ہے جیسے چائے کے کپ میں سات سمندر آ جائیں یہ مشکل ہے۔ اور تنگ ہونے پر کچھ روشنی ڈالتا

ہوں۔ کہ دنیا کی ہئیت کچھ ایسی بنائی گئی ہے کہ فلاح سب کی سب حاصل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اگر زندگی ہو اور موت نہ ہو تو زمین اتنی تنگ ہو جاتی کہ جس پر رہائش ناممکن ہو جاتی۔ اس جہان کے تغیرات ایسے ہیں کہ آدمی ہر حال میں تندرست نہیں رہ سکتا حالانکہ فلاح کا تقاضا ہے کہ آدمی بیمار نہ ہو۔ دنیا میں بڑھاپا بھی ہے اور فلاح میں بڑھاپا نہیں۔ معلوم ہو گیا کہ دنیا کی زمین فلاح کیلئے تنگ تھی موسم کے لحاظ سے کبھی گرمی اور کبھی سردی جب گرمی ہو تو انسان سردی کی اور جب سردی ہو تو گرمی کی خواہش کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ دنیا کی تمام خصوصیات پر اگر نظر ڈالیں تو اس میں فلاح کی گنجائش نہیں۔ اس لئے اللہ تعالی نے فلاح جیسے مطلوب اعظم کو آخرت میں رکھا۔ اگر ساری دنیا آپ کی ہو جائے تو پھر بھی کامیابی نہیں کیونکہ موت کے بعد سب یہاں رہ جائے گی۔ فمن زحزح عن النار جس کو اللہ تعالی نے دوزخ سے دور کیا وادخل الجنۃ فقد فاز۔ یہ کامیابی ہے جو آخرت میں ملے گی۔ فلاح کو ان دو لفظوں میں بند کیا۔ وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور۔ اور دنیا کی زندگی میں سرمست ہو جانا یہ دنیا کا دھوکہ ہے۔ جو آدمی کو فلاح کے عظیم الشان مقصد سے محروم کر دیتا ہے اور فلاح کیلئے فرمایا کل من علیھا فان۔ اکبر الہ آبادی کو ایک دوست ملنے آیا تو چٹ کی پشت پر یہ لکھ کر ملاقات سے معذوری کر دی۔

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا۔
اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا۔

بہر حال فلاح کا مقام آخرت ہے جب مقام آخرت ہے تو اس کے اسباب کیا ہونگے۔ اسے ایک بزرگ کے قصہ سے حل کرتا ہوں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ یہ ایسے بزرگ گذرے ہیں۔ ایک غریب آدمی کسی کا مرید ہونا چاہتا تھا تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں تشریف لائے کہ رشید احمد ہندی کا مرید ہو جا اس کے پاس سفر خرچ کیلئے پیسے نہ تھے آپ پھر تشریف لائے فرمایا کہ نہیں گیا عرض کی پیسے نہیں ہیں فرمایا جا پیسے ملیں گے تو جہاں جاتا راستہ میں پیسے ملتے جاتے تھے۔ دوسرا ایک شخص تھا حضرت پیران پیر رحمۃ اللہ علیہ کا معتقد تھا وہ کہتا تھا کہ پیران پیر جب کہے گا کہ فلاں کا مرید ہو جا تو اسی کا ہونگا۔

کذالک جعلنا لکل نبی عدوا شیطن الانس والجن۔ یعنی شیطان انسانوں اور جنوں میں نبی کے دشمن ہیں کیا جس کے دشمن ہوں یہ اس کے باطل ہونے کی دلیل ہے؟۔ تو مولانا فضل الرحمان گنج مراد آبادی کے پاس کسی نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی مذمت کردی تو آپ نے کچھ کشف کیا اور فرمایا کہ میاں تم چاہے جو

بکواس مارو میں نے تو ان کے قلم کو عرش سے آگے چلتے دیکھا ہے۔ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے مریدوں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس لکھا کہ مرید ہونے کے بعد بتاؤ دل کی کیا حالت ہے۔ یہ اس لئے پوچھا تھا کہ لوگوں کو ہندوستان سے مکہ شریف جا کر بیعت ہونا مشکل تھا۔ حضرت نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نے تو عاجزی سے لکھا کہ ہمارے دل کی کیا حالت ہو۔ مگر حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ تین باتیں ہیں۔ (1) اسلام کی باتیں جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہیں ان میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ باقی جو گناہ پیدا ہوتا ہے وہ بے یقینی سے پیدا ہوتا ہے۔ (2) بات یہ کہ حضرت عبادت عادت بن گئی ہے۔ جس طرح عادت پر چلنے میں مزہ آتا ہے اور ترک کرنے میں تکلیف ہوتی ہے یہ میری حالت ہے اور جس طرح عادت ترک نہیں ہوسکتی یہ حال میری عبادت کا ہے۔ (3) ساری دنیا میری مذمت کرے یا ساری دنیا چاہے میری نیکی بیان کرے تو طبیعت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یعنی نہ غصہ نہ خوشی تو اس پر حضرت مکی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا یہ تو فلاح کے مقام ہیں۔ تو فلاح کے تین اسباب ہیں۔ (1) علم و عقیدہ اعلیٰ درجہ کا ہو اور مضبوط ہو نیم علم بھی خطرہ ہے۔ یہی دیکھا گیا ہے کہ جو خالص عالم ہو یا بالکل جاہل ہو تو وہ قادیانی

نہیں ہوا اور نیم عالم قادیانی دیکھے ہیں۔ (2) عمل مضبوط ہو۔ (3) اخلاص ہو۔ امام رازی رحمتہ اللہ علیہ نے تفسیر میں لکھا ہے کہ ایک بدو جارہا تھا راستے میں ایک فلاسفر مل گیا فلاسفر نے جی بہلانے کیلئے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ پوچھتا ہے کہ خدا تعالی کے ہونے کی تمہارے پاس کیا دلیل ہے اس نے کہا کہ اپنے ہاں تو یہی ہے کہ جس میدان میں ہم اونٹ کی مینگنی دیکھ لیں تو ہم جانتے ہیں کہ یہاں سے اونٹ گذرا ہے چاہے ہم نے نہ دیکھا ہو۔ فالسماء ذات النجوم ۔ تو زمین اور ستاروں والا آسمان یہ کیونکر اللہ تعالی کی دلیل نہیں تو فلاسفر نے سمجھ لیا کہ میں تو اسے جاہل سمجھتا تھا یہ تو سمجھ دار ہے پھر دوسری بات کی کہ مرنے کے بعد اعمال کی جزا ہے؟ بدو نے کہا ہاں مگر فلاسفر نے کہا نہیں۔ تو بدو نے کہا کہ میرا جو خیال ہے اس کے مطابق میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آگے چل کر دو باتیں درست ہونگی یا میری یا تیری اگر میری بات سچی نکلی تو میں تو جنت میں اور تو جہنم میں ہوگا۔ تو فلاسفر حیران ہو گیا۔ اقبال:

ہے شیخ بہت اچھی کالج کی فضاء لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقیؓ و عثمانیؓ

اکبرؔ الہ آبادی:۔

خدا ہی کی ہدایت کرتی ہے نور یقیں پیدا
دلیلوں کی رسائی فقط وہم و گماں تک ہے

نظام مملکت آدمؑ سے لیکر آخرت تک حضرت فاروق اعظمؓ جیسا کوئی نہیں چلا سکتا۔ تو کیا حضرت فاروق اعظمؓ نے کسی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی بلکہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس کی مثال میں یہ دیتا ہوں کہ رات کے وقت ایک آدمی کہے کہ میاں راستہ میں سانپ ہے اور فلاں راستہ سے نہیں۔ تو اگر ہو گا تو نقصان ہو گا اور اگر نہ بھی ہو تو احتیاط ضروری ہے۔ صحابہ کرامؓ کی زندگی میں یہ یقین تھا کہ انہیں ایک منٹ کے اندر ایمان لانے سے جو نور حاصل ہوتا تھا وہ ہم میں پچاس سال زندگی میں بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ جنگ بدر میں ایک شخص آیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اسلام کی تو کہا کہ میں اسلام لایا۔ تو پھر پوچھا کہ مرنے کے بعد کیا ہو گا۔ آپ نے فرمایا جنت ملے گی۔ وہ کھجوریں لئے ہوئے تھا۔ فالقی التمرات۔ کھجور کو پھینک دیا اور شہید ہو گئے تو آپ نے فرمایا۔ فعمل قلیلاً و حصل اجرا کثیراً۔ آپ نے فرمایا کہ اس نے عمل تھوڑا کیا اور اجر کثیر لیا۔ یہ ہے یقین۔ تو حضرت نے فرمایا کہ فلاح کا بڑا سبب یہ ہے کہ عقیدہ اتنا مضبوط ہو کہ دنیا تباہ ہو جائے مگر اللہ تعالیٰ سے یقین کم نہ ہو۔

اکبر الٰہ آبادی فرماتے ہیں:۔

گو فلسفہ میں بہت چناں و چنیں رہی
پر اللہ کی جو بات تھی وہ وہیں رہی

دوسری یہ کہ عبادت عادت بن جائے مطلب یہ کہ اس کے ترک کرنے میں اتنی تکلیف ہو جتنی کہ عادت کے ترک کرنے میں ہوتی ہے۔ تیسری چیز اخلاص ہے اس کا مدمقابل ریاء ہے۔ کہ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے نیکی کرے اور لوگوں کو خوش کرنے کیلئے بدی کو ترک کرے یہ بلا اجر عمل ہے۔ تو یہ جو فرمایا کہ لوگ چاہے نیکی یا چاہے بدی بیان کریں طبیعت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مطلب یہ کہ طبیعت میں سو فیصد ریاء نہیں۔ ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولئک ھم المفلحون۔ جو یہ کام کریں وہ فلاح والے ہیں تو اس سے بھی وہی بات نکلی کہ جو آدمی نیکی پھیلائے اور بدی سے روکے گا اس میں عمل، عقیدہ اور اخلاص ہوگا۔ تو معلوم ہو گیا کہ جو مذکورہ بالا آیت والے کام کرے گا وہ فلاح حاصل کرے گا۔ فامامن خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ۔ فان الجنۃ ھی الماویٰ۔ جس کو اللہ کے سامنے حساب کی خاطر پیش ہونے کا ڈر ہو وہ اپنے نفس کو روک لے تو جنت اس کا ٹھکانہ ہے۔ تو خوف خدا بہت بڑی چیز ہے۔ صحابہ

کرامؓ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دنوں سے آپ
کی ریش مبارک کے بال مبارک سفید ہو رہے ہیں فرمایا شابتنی ھود
والمرسلات کہ سورۃ ھود اور مرسلات میں چونکہ قیامت کے حالات ہیں
ان کی تلاوت کی وجہ سے بال سفید ہو گئے۔ آپ نے فرمایا لو تعلمون
ما اعلم مجھے جن باتوں کا یقین ہے انکا تمہیں یقین ہو جائے۔ ولبکیتم
کثیرا اوخرجتم الی المیدان تم بہت روؤ گے اور میدان میں بھاگو
گے۔ اور چیخو گے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے فرمایا میں تو
درخت ہوتا کہ کٹ جاتا۔ ما جعل اللہ فی الدین من حرج۔ کہ میں نے
دین کو مشکل نہیں بنایا۔ حدیث الدین یسر کہ دین آسان ہے۔ اور
جنت کے حصول کیلئے فلاح بہت بڑا مقصد ہے۔ حضرت مولانا محمد
قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا جنت کیا چیز ہے
فرمایا بندہ کیلئے ایک چھوٹی سی خدائی ہے کہ قرآن نے کہا ولکم فیھا
ما تشتھی انفسکم کہ جی چاہا اور زبان چاہا ملے گا اس مطالبہ کو کون پورا
کر سکتا ہے تو واقعی ایک چھوٹی سے خدائی ہے انی جاعل فی الارض
خلیفہ۔ تو خلیفہ کو خدائی کا کچھ نہ کچھ حصہ تو ملے وہ صرف اتنا ہے کہ
تم جو کچھ مانگو ملیگا۔ فلاح کیلئے ایک سبب یہ بھی ہے کہ طاعت الٰہی
ہو وہ کوئی مشکل نہیں ۔ بس ایک فرضیات ہیں جو کریں اور
منہیات سے رکیں۔ اس میں کیا مشکل ہے کہ پانچ فرض ادا کریں تو
جنت مل گئی۔ اور نوافل وغیرہ جنت میں جگہ بڑھانے کا سبب ہیں

یعنی جنت کی جائداد بڑھانا ہے۔ لیکن اصل فلاح کا تعلق فرضیات کی بجاآوری اور منہیات سے رکنا ہے۔ گناہ سے بچنے کی حقیقت یہ ہے کہ ان اعمال کو نہ کرو جن سے آخرت میں تکلیف ہو گی۔ پھر اگر اس کی خلاف ورزی ہوجائے تو اللہ تعالیٰ نے فلاح کو کتنا آسان کیا ہے کہ حکم دیا کہ جو تم نے فلاح کے اسباب میں کوتاہی کی ہے تم توبہ کرلو میں بخش دونگا۔ اگر توبہ کرنے کے بعد پھر ماموارت کو ترک کیا تو اللہ نے فرمایا تم توبہ کرتے جاؤ میں توبہ قبول کرتا چلا جاؤں گا۔ تمہارا کام توبہ کرنا ہے اور ہمارا کام ہے بخش دینا۔ التوبۃ مقبولۃ حتی غرغر کہ جان کنی کے وقت تک توبہ قبول ہے۔

معلوم ہو گیا کہ فلاح آسان چیز ہے۔

درس نمبر۲
4 ستمبر 1966ء

ہدایت کے تین باب

اس درس سے پھر ان الذین کفروا۔ سے مضمون شروع ہوتا ہے۔ اس سورۃ کے شروع میں تین قسم کے لوگوں کا یا تین قسم کے گروہوں کا بیان ہے۔ ایک گروہ وہ جو دل اور زبان دونوں سے دین حق کو مانتا ہو یہ متقین کا گروہ ہے۔ جس کا بیان ھدی للمتقین کے تحت بیان ہو چکا ہے۔ متقین کی وضاحت کیلئے پانچ آیتیں فرمائیں۔ دوسرا گروہ متقین کی ضد ہے کہ زبان اور دل سے دین حق کا منکر ہو۔ ان الذین کفروا۔ سے آج اسی منکر گروہ کا ذکر ہے۔ اس گروہ کے بارے میں دو آیتیں آئی ہیں۔ تیسرا گروہ منافقین کا ہے کہ دین حق کو زبان سے مانتا ہو دل سے نہ مانتا ہو اس گروہ کو اللہ تعالی نے زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس گروہ کیلئے 13 آیتیں بیان فرمائیں۔ تو ان آیتوں کے ربط کیلئے دو مثالیں دونگا۔ ایک مائی یعنی پانی کی مثال دوم ناری یعنی آگ کی مثال۔ لفظی ترجمہ تحقیق جو لوگ دین حق نہیں مانتے برابر ہے ان پر چاہے تم

ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ نہیں مانتے۔ نہ ماننے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کانوں اور منہ پر مہر لگا دی ہے اللہ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ہے ان کیلئے عذاب دردناک ہے) یہ تعبیر عام ہے مگر مراد خاص ہے اب اگر ان کو ہم عام لیں تو معلوم ہوگا کہ ہر کافر ایمان نہ لے آئے گا۔ اگر ہر کافر ایمان نہ لاتا تو یہ کروڑوں مسلمان کیسے پیدا ہوتے بلکہ تاریخ کے ہر ماہ میں کچھ نہ کچھ کافر ایمان لاتے رہتے ہیں۔ جب کافر ایمان لاتے ہیں تو اللہ یہ اعلان کیوں کرتے ہیں کہ لایؤمنون اور جب ایمان نہ لائیں گے تو پھر کتابوں اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کیوں فرمائی تو اس سے اللہ کی مراد خاص ہو جاتی ہے ان الذین سے خاص کفار مراد ہیں۔ ایک وہ کفار جن کی قسمت میں ایمان لانا نہیں لکھا۔ اور دوم وہ جن کی قسمت میں ایمان لانا لکھا ہے تو جن کی قسمت میں ایمان لانا نہیں لکھا یہ آیت ان کیلئے ہے۔ تو اس طرح سب آیتیں منطبق ہو گئیں آپس میں ٹکرائی نہیں۔ ومن یرتد منکم عن دینہ۔ تم میں سے اگر کوئی مرتد ہو جائے تو ناز نخرے نہ کرو اللہ ایک ایسی قوم کو اسلام دیگا جو اللہ سے اور اللہ ان سے محبت کریں گے۔ تو معلوم ہو گیا کہ اللہ جب کام لینا چاہے تو غیر سے لے سکتا ہے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کفار کو ایمان کی نعمت دیتا رہتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام کی توسیع کا سلسلہ جاری رہے گا۔ تو معلوم ہو گیا کہ ان الذین کفروا۔ سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفر پر

مریں گے جس طرح علماء نے لکھا ہے ابوجہل و ابی لہب تو دو چیزیں بیان ہوئیں ایک ان الذین کفروا۔ کی آیت کا ربط اور دوسرا اس کا مصداق کہ کن کفار پر یہ آیت آئی ہے۔ سواء علیھم الخ۔ کہ ڈراؤ یا نہ ڈراؤ ایمان نہ لے آئیں گے۔ ڈرانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا مگر ان کو تبلیغ سے منع نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ یہ لوگ مانیں یا نہ مانیں مبلغ کو تبلیغ کرنا ضروری ہے اگر نہ مانیں تو تبلیغ کا پھر بھی ثواب ہے اس لئے سواء علیک نہیں فرمایا سواء علیھم فرمایا۔ ایک شخص ایسے لوگوں کو تبلیغ کرتا ہے جو ماننے والے ہیں اور دوسرا مبلغ ان کو تبلیغ کرتا ہے جو نہیں مانتے تو ثواب میں اس دوسرے کا درجہ بلند ہے اس کے بعد یہ ہے کہ وہ کفار جن کی موت کفر پر ہو گی ان میں لاتعداد عیوب ہو سکتے تھے مگر اللہ تعالی نے ان کے صرف دو عیب ذکر کئے۔ بس ان سے بڑھ کر اور کوئی عیب نہیں ہے۔ (1) عیب یہ ہے کہ انذرتھم معنی یہ کہ تبلیغ کا اثر نہ ہو گا اگر کسی مسلمان کا دل ایسا ہو کہ اس کے دل پر تبلیغ اثر نہ کرے تو یہ ان کافروں کی مثل ہو گیا۔ تو مومن کو اس طرح ہونا چاہیئے کہ ان پر تبلیغ اثر کرے۔ (2) دوم چیز اس کے سبب کا بیان ہے کہ مسلمان یا کافر جو تبلیغ سے متاثر نہیں ہوتے اس کی وجہ کیا ہے۔ ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ۔ کہ تاثیر کے تینوں دروازے بند ہیں۔ دل، کان، اور آنکھ کا دروازہ تینوں بند

ہیں ان تینوں پر دل اور کان پر مہر اور آنکھ پر اللہ نے پردہ لگا دیا ہے ان حالات میں ہدایت کے تینوں راستے بند ہیں اس لئے لایؤمنون لایا ہے۔ تین دروازے اس لئے لکھے ہیں کہ ہدایت کا سب سے بڑا مرکز حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو پہلے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ آدمی ھادی کو دیکھے۔ یعنی جس سے ہدایت لینی ہو اس کے ساتھ بیٹھے سنگت رکھے۔ تو یقینی بات ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ واسلام کا دیدار بھی ہدایت کیلئے موثر ہے اسی لئے حضرات صحابہ کرامؓ جیسا کوئی نہیں ہوسکتا کیونکہ ان کو دیدار نصیب ہے۔ اور دیدار کا تعلق آنکھ سے ہے۔ دیدار کے متعلق ایک خاص چیز یہ ہے کہ دیدار کی دو قسم ہیں۔ (1) عظمت و عقیدت سے دیدار کرے۔ (2) بغض و نفرت سے دیدار کرے۔ دیدار دونوں جگہ ہے مگر فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی ذات حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی ابوبکرؓ و عمرؓ نے بھی دیکھا اور ابوجہل وابولہب نے بھی دیکھا۔ ابوبکرؓ و عمرؓ گویا عقیدت اور عظمت سے دیکھتے تھے اور وہ دونوں نفرت سے دیکھتے تھے۔ پہلے زمانہ کے بادشاہ اللہ والوں سے تعلق رکھتے تھے اس لئے دین و دنیا دونوں مین کامیاب تھے۔ جب دنیا والوں نے دین والوں سے جوڑ توڑ دیا تو سب کا خاتمہ کردیا۔ آج جو لوگ دفتروں میں رشوت کھاتے ہیں ان کو دین والوں سے جوڑ نہیں۔

سلطان محمود غزنوی رحمتہ اللہ علیہ حضرت ابوالحسن
رحمتہ اللہ علیہ خرقانی کی زیارت کو گئے تو اس نے سوال کیا کہ
حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جو میرا دیدار کریگا
اس کیلئے جنت ہے۔ یہ بزرگ حضرت خرقانی رحمتہ اللہ علیہ سے
ایک سو سال پہلے گذرے ہیں۔ تو بادشاہ نے عرض کی کہ اگر جنت
دیکھنے پر موقوف ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کفار
نے بھی تو کیا تھا۔ فرمایا ابولہب و ابوجہل نے محمد رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کا دیدار نہیں کیا بلکہ انہوں نے محمد بن عبداللہ کا دیدار
کیا ہے۔ اور جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کرے گا اس
کا دل عقیدت سے لبریز ہو جائے گا۔ وتراھم ینظرون الیک وھم
لایبصرون۔ اے محمد تم دیکھتے ہو کہ وہ کفار تمہیں دیکھ رہے ہیں مگر
اس کے باوجود وہ آپ کو نہیں دیکھتے۔ عبداللہ ابن سلام یہودیوں
کے سب سے بڑے عالم تھے جب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ
وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھتے ہی فرمایا کہ یہ چہرہ جھوٹے کا
نہیں ہوسکتا۔ جس کے دیدار سے خدا یاد ہو وہ ولی ہے اور اگر دنیا یاد
ہو تو وہ ولی نہیں ہے۔ پھر دیدار کے بعد پیغمبر علیہ السلام قرآن و
سنت سے کچھ ارشاد فرمائیں گے۔ کان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی
سنائی ہوئی حدیث کو سنیں گے تو ھدایتہ کا دوسرا دروازہ کان ہے۔
پھر انکے بعد ہدایت کا تیسرا اور آخری دروازہ دل ہے۔ وعلی

قلوبھم۔ اگر دل درست ہو تو درست فیصلہ کرے گا ورنہ غلط فیصلہ کرے گا۔ قاعدہ تو یہ ہے کہ پہلے آنکھ سے زیارت ہوتی ہے پھر کان سے سنا جاتا ہے پھر دل سے قبول کی جاتی ہے۔ مگر اللہ تعالی نے ترتیب الٹ دی۔ قلب کو اول لایا بعد میں کان اور بعد میں آنکھ۔ اس کی مثال یہ ہے کہ میاں فلاں کاغذ فلاں کلرک سے دستخط کرالاؤ۔ پھر فلاں سے دستخط کراؤ بعد آکر ڈپٹی سی یا کوئی اور آفیسر دستخط کرتا ہے تو بعد میں کام ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالی نے اصل طاقت کو پہلے لایا بعد میں کان کو لایا۔ کان کا مرتبہ بلند ہے یا آنکھ کا؟۔ اگر کوئی بہرہ ہے تو وہ آنکھ کے اندھے کی نسبت زیادہ نقصان دہ ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یوں تفسیر کی کہ جب اللہ تعالی نے دل کے بعد کان کا ذکر فرمایا ہے۔ تو معلوم ہوگیا کہ کان آنکھ سے بلند چیز ہے۔ یورپ اور امریکہ نے ابھی یہ ان ٹل فیصلہ کیا ہے کہ کان کا درجہ آنکھ سے بڑھ کر ہے کیونکہ کان والا سنتا تو ہے۔ آج کل ایک انگریز اس بات پر مسلمان ہوا ہے کہ یورپ وغیرہ نے تو آج کان کا درجہ آنکھ سے بلند کیا ہے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے تیرہ سو سال پہلے بیان کیا ہے اندھا دنیا کی صورت سے محروم ہے حقیقت سے محروم نہیں اور بہرہ حقیقت سے آگاہ نہیں صورت دیکھتا ہے تو حقیقت کو صورت سے فضیلت ہے اندھا حقیقت کو جان لیتا ہے یعنی لوگوں سے پوچھ

گوچھ کر حقیقت پالے گا مگر بہرہ نہیں پا سکتا۔ تو کان سے حقیقت شناسی اور آنکھ سے صورت شناسی ہوتی ہے۔ تو اس لئے قرآن نے دوم نمبر پر سمع کو بصر سے پہلے ذکر کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کافر جو تبلیغ سے متاثر نہیں ہوتے تو عدم تاثر کا سبب تین چیزیں بیان کیں۔ ان میں قلب کو پہلے رکھا معلوم ہو گیا کہ ان کفار کی بنیادی چیز قلب فاسد ہے۔ دین کا نقصان لازوال ہے اور دنیا کا نفع و ضرر چند دن کیلئے ہے۔ تو انسان کے دو مکان ہیں ایک دنیاوی جس میں ضروری سامان رکھتا ہے اور دوسرا ایمان کا گھر ہے یعنی قلب اس میں ایمان رکھا ہے۔ دنیا کا نقصان یہ ہے کہ گھر میں چور گھس آئے اور جو سامان اندوختہ کیا ہے وہ چھین لے تو چور کو یا پولیس پکڑے گی یا پھر مالک مکان تیار ہوتا ہے کہ اسے بھگا دے گا۔ مگر اس کے مقابلہ میں دین کا نقصان بڑا بھاری ہے اور نقصان پہچانا بھی بڑا آسان ہے۔ یعنی صرف قلب کا تصور پلٹ جائے۔ عربی میں قلب کا معنی ہے پھرنے والی چیز یعنی پلٹ جانے والی چیز۔ مثلاً آج ایک چیز کو صحیح مانتا ہے مگر کل کہتا ہے کہ یہ غلط ہے اس لئے قلب کا معاملہ بڑا نازک ہے کیونکہ دل اگر پھرا تو پھر بچنے کا کوئی مقام نہیں۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے یامقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک ۔ اے قلوب کو پھیر دینے والے خدا میرے دل کو اپنے ایمان پر پھیر دے۔ اور پھر مصیبتوں

کے متعلق فرماتے ولا تجعل مصیبتنا فی دیننا کہ یا اللہ ہمیں دین کی مصیبت میں نہ ڈال اور فرمایا ولا تجعل الدنیا اکبر ھمنا کہ ہمارے دل میں دنیا کی عظمت نہ بڑھا۔ کیونکہ دنیا تو جب انسان مرے ایک سیکنڈ میں ختم ہو جاتی ہے۔ ولا مبلغ علمنا اور ہمارے علم کی آخری سرحد دنیا کو نہ بناؤ۔

درس نمبر۳
9 ستمبر 1966ء

دنیا حق وباطل کا مجموعہ ہے

ان الذین کفروا سواء علیھم أنذرتھم ام لم تنذرھم لایؤمنون ۔ ترجمہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اس کیلئے دو باتوں کا خیال ہونا چاہیئے۔ کہ دنیا میں ایک حق اور ایک باطل ہے۔ حق عقیدہ، حق اخلاق اور حق عمل اور حق کے مقابل باطل بھی ہے۔ باطل عقیدہ، باطل اخلاق، باطل عمل تمام نبیوں کی بعثت اس لئے ہوئی ہے کہ انسان حق کو مانے اور باطل کو چھوڑے مثلاً خدا ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور آخری نبی ہیں قیامت جنت و دوزخ یہ سب حق ہیں۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے وقت آسمان پر نگاہ ڈال کر ایک لمبی دعا پڑھتے تھے الجنتہ حق والنار حق و محمد حق والنبیون حق۔ تو تمام آسمانی کتب اور انبیا علیھم السلام کا مقصد حق کی دعوت اور باطل سے روکنا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حق اللہ تعالی کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور ہمارا دین اسلام کا عقیدہ اور ایک ایک عمل

وغیرہ حق ہے تو جو حق اختیار کرے گا وہ اللہ سے جڑ گیا کیونکہ اللہ
بھی حق ہے اور جو باطل سے جڑ گیا وہ حق سے کٹ گیا۔ اس لئے
دل اللہ سے کٹ گیا۔ ذالکم الحق۔ قل جاء الحق وزھق الباطل۔ جب
مکہ معظمہ فتح ہوا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بتوں کو چھڑی
سے ہٹاتے تھے اور یہ آیت پڑھتے تھے۔ تو جو اہل حق ہیں وہ
ثابت ہیں کیونکہ حق کا لغوی معنی ثابت ہے وہ جنت آخرت اور
قبر میں ثابت ہیں اور لازوال ہیں۔ فاما الزبد فیذھب جفاء۔ جو فائدہ
مند چیز ہوتی ہے وہ باقی رہتی ہے اور آگے فرماتے ہیں وکذلک
یضرب اللہ الحق والباطل۔ فرمایا کہ اللہ ایسی مثالیں دیتا ہے ک جب
سونا کٹھالی میں چکر کھاتا ہے تو میل کچیل نظر آتا ہے اور ٹھنڈا ہونے
تک وہ میل کچیل ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دریاء جب زور پر ہوتا
ہے تو اس کے اوپر جھاگ اور گند ہوتا ہے اسی طرح اللہ نے فرمایا کہ
سونا کی عمر زیادہ ہے اور میل کچیل کی عمر کم ہے اور دریاء کے پانی
کی عمر زیادہ اور جھاگ کی عمر کم ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ
علیہ نے فرمایا کہ اس مثال میں اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ کیا کہ میل کچیل اور
جھاگ باوجود اوپر رہنے کے کم درجہ و کم عمر کی ہے جو کہ باطل ہے۔
لبید رحمۃ اللہ علیہ عرب کا مشہور شاعر گذرا ہے۔ اس کی عمر ایک سو
ساٹھ برس کی تھی 80 سال کافر رہا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے زمانے میں تھا مگر زیارت سے محروم رہا۔ جب اسلام لایا تو شعر

پڑھنا بند کر دیا تو لوگوں نے کہا آپ اب شعر کیوں نہیں پڑھتے تو فرمایا کہ مجھے قرآن سے شرم آتی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے ایک شعر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس پہنچا تو آپ نے فرمایا شعراء میں سے صرف لبید کی بات سچی ہے اس کے پہلے مصرع کا ترجمہ۔ کہ خوب سن لو کائنات کا ہر ذرہ مٹ جائے گا ماسوا اللہ تعالی کے۔ شارحین کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مصرع کو تو فرمایا اور دوسرے کا ذکر نہیں فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس فقرہ کا مضمون غلط ہے کیونکہ ایک نعمت جنت بھی ہے جو مٹنے والی نہیں۔ مگر اس نے مصرع یوں کہا۔ وکل نعیم لامحالہ زائلہ۔ تو بہر حال جب یہ معلوم ہوگیا کہ دنیا حق و باطل کا مجموعہ ہے حق لازوال اور باطل زوال پذیر ہے۔ حق کا تعلق اللہ تعالی سے ہے اور جو باطل سے جڑا وہ اللہ سے کٹ گیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا مبارک ہے اللھم خلط القرآن بدمی ولحمی وبجمیع اعضائی کہ یا اللہ قرآن کو میرے پورے جسم میں پیوست کردے تاکہ میں لازوال حق کی طرح بن جاؤں کیونکہ قرآن حق ہے اور حق لازوال ہے۔

حضرت جلال الدین رومی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب تم قرآن کی طرف بھاگو گے تو پیغمروں کی روحیں تمہاری روح کے ساتھ مل جائیں گی۔ یعنی تمام پیغمبروں کی برکتیں آپ

کے ساتھ ہو جائیں گی۔ اب آیت کا ترجمہ معلوم ہو جائے گا۔ اللہ تعالی نے انسان کو ایک قلب دیا ہے جو انسان کے سوا کسی کے پاس نہیں یہ اس لئے دیا ہے کہ اس سے انسان حق کی شناس کرے اور اگر حق شناسی سے عاجز ہے تو دوسری قوت سمع کی دی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور علماء کرام سے سن کر حق کو پا لے۔ اگر اس کے بعد بھی حق شناسی نہ ہو تو تیسری قوت بصر آنکھ کی دی ہے تاکہ حق والوں کی صحبت اختیار کرے اور آنکھ سے دیکھ کر حق کو پا لے۔ دل کے متعلق دل دو چیزیں ہیں۔ (1) زمینی دل جو گوشت کا دل ہے زمینی دل بائیں جانب اور (2) دوسرا اس کے اندر ایک نورانی لطیف دل ہے اس کو روحانی دل کہتے ہیں۔ اللہ تعالی نے جب دل بنایا تو آسمان سے ایک نور بھی اتارا۔ انسان کے اندر صرف قلب ہی ہے جو آسمانی چیز ہے۔ اللہ تعالی جب رحم مادر میں انسان کو پیدا کرتا ہے تو دل کے اندر ایک روحانی چیز ڈال دیتا ہے جس طرح بجلی کے بلب کے اندر روشنی ہوتی ہے۔ حرارت عزیزی پیدائشی طور پر اللہ کی جانب سے رحم مادر میں اتار دی جاتی ہے۔ وہ جب معدہ میں ہو تو ہضم اور جب جگر میں ہو تو خون پیدا کرتی ہے۔ اور جب دل میں ہو تو خون صاف کرتی ہے اور جب آنکھ میں ہو تو دیکھنے کا کام کرتی ہے اور یہ حرارت عزیزی اللہ تعالی کے حکم سے مانتی ہے۔ انسان کے اندر دو آسمانی چیزیں

ہیں ایک روحانی نور جو قلب کے اندر ہے اور دوسری حرارت عزیزی ہے۔ امام فرماتے ہیں کہ دل اور دماغ میں ایک تار ہے جو اللہ سے وابستہ ہے۔ اس کا اللہ کے سوا کسی کو علم نہیں۔ اس لئے اللہ تعالی نے نور کو قلب میں بھرا ہے۔ جس طرح پانی تو چشمہ میں ہے اور جب پھوٹ پڑتا ہے تو کہتے ہیں کہ دریاء ہے۔ اسیطرح دل کی تدبیر چشمہ ہے جب پھوٹ پڑتی ہے تو دماغ میں آجاتی ہے۔ دل کو اس لئے پیدا کیا کہ حق کو مان لو۔ کان اس لئے پیدا کیا کہ حق کو سن لو اور آنکھ کو اس لئے بنایا کہ حق کو دیکھ لو۔ اور ان تینوں اعضاء کو بیماری بھی ہوتی ہے۔ تو کچھ امراض القلب ہیں۔ قلب بیمار بھی ہوتا ہے۔ حدیث ان فی الجسد لمضغۃ اذا صلحت صلحت کلہ واذافسدت فسدت کلہ الاوھی القلب۔ دل کو عربی زبان میں قلب کہتے ہیں اور قلب کا معنی ہے (پھرنا) یہ نام اس لئے رکھا کہ قلب پھرتا رہتا ہے۔ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دل ہی کی وجہ سے بدبختی اور خوشبختی اور جنت و جہنم کا تعلق ہے۔ اگر انسان کے جسم میں قلب نہ ہوتا تو صوم وصلوۃ وغیرہ نہ ہوتی۔ قلب رکھ کر اللہ نے فرمایا کہ بالغ ہونے کے بعد تو ماموارت کو مانے گا اور منہیات سے رکے گا۔ حدیث القلب کریشۃ فی فلاۃ یقلب الریاح کہ دل کی مثال ایسی ہے کہ جس طرح ایک پر میدان میں ہو جس کو ہوائیں الٹتی پلٹتی ہیں اس لئے اس گوہر نایاب کی حفاظت کی بڑی

ضرورت ہے۔ الا بقلب سلیم ۔ اس کی تندرستی کی پہچان کیلئے ایک علامت ہے مثلاً وہ علامت یہ ہے کہ اللہ تعالی نے جو عضو جس مقصد کیلئے بنایا ہے۔ وہ وہی کام کرے تو عضو درست ہے ورنہ بیمار ہے۔ مثلاً کان کو سننے کیلئے بنایا جو کان حق سن نہ سکے اور جو دل حق نہ پہچانے وہ بیمار ہے۔ کیونکہ دل کو جس مقصد کیلئے بنایا گیا تھا اس نے اس مقصد کو حل نہ کیا۔

ایک نیکی کی ٹریننگ ہے کہ مکہ و مدینہ کو جاؤ یعنی حرمین شریفین جانا۔ اور ایک ٹریننگ فسق و فجور کی ہے کہ یورپ و امریکہ جاؤ دیکھو دن قریب ہے قبر دور نہیں۔ موت تو یہ ہے کہ بس دل حرکت کرنا بند کر دے۔ اس وقت کو غنیمت سمجھو کہ پتہ نہیں کہ اللہ تعالی نے دل کی چابی کتنے دن کی بھری ہے۔ دنیا کی اربوں غلطیاں دین کی ایک غلطی سے کم ہیں۔ آج سنبھل جاؤ ورنہ کل نہ وزارت اور نہ صدارت وغیرہ وغیرہ رہے گی۔ تو اللہ تعالی نے قلب معرفت حق کیلئے بنایا ہے۔ جو دل حق کو نہ پہچانے وہ دل نہیں۔ دوم عمل حق کیلئے بنایا ہے جو عمل حق نہ کرے وہ قلب مریض ہے۔ بزرگان دین نے سورۃ فاتحہ کے تحت فرمایا ہے کہ آدمی دو غلطیاں کرتا ہے۔ کہ اس نے حق کی پوری شناس نہ کی اس وجہ سے کہ اس نے حق پہچاننے کیلئے کوشش نہیں کی۔ یعنی تحقیق نہیں کی۔ یہ ہیں ولا الضالین اور دوسرے وہ ہیں کہ حق کو پہچانا مگر عمل نہ

کیا۔ یہ مغضوبین ہیں۔ تو دل کی دو بیماریاں ہوئیں۔ ایک یہ کہ حق کو نہ پہچانا اور دوم یہ کہ حق کو پہچانا مگر عمل نہ کیا۔ (1) ایک نادانی۔ (2) غلط دانی۔ نادانی کا معنی یہ کہ غلطی کرتا رہا مگر حق کو نہ جانا۔ اور ایک ہے غلط دانی کہ دو دونی چار کی طرح دین کو جانا مگر عمل نہ کیا یہ ہیں حق کو غلط شکل اختیار کرنے والے۔ تیسرا سبب جس سے قلب بیمار ہو جاتا ہے۔ وہ غفلت عن العواقب یعنی نتائج سے غافل ہونا مثلاً آدمی گناہ کرتا ہے کہ وہ نتیجہ سے غافل ہے۔ دل اس لئے آیا ہے کہ وہ نیکی و بدی کے نتیجہ کو دیکھے۔ تو جو دل ایسا ہے کہ وہ اپنا کام نہیں کرتا تو یہ مریض ہے۔ پھر جب قلب بگڑ جاتا ہے تو آنکھ اور کان بگڑ جاتے ہیں۔ ولقد ذرانا لجہنم من الجن والانس کہ ہم نے جہنم کیلئے بہت سے جن وانس جمع کر رکھے ہیں۔ کہ آنکھ دی مگر دیکھتے نہیں ہیں کان دیئے سنتے نہیں۔ ولہم اعین لایبصرون بہا ولہم اذان لایسمعون بہا۔ فرمایا کہ یہ چار پاؤں کی مثل ہیں۔ اولئک کالانعام پھر فرمایا کہ ان سے بھی بدتر ہیں بل ھم اضل۔ کیونکہ حیوان اپنا کام کر رہے ہیں یقینی بات ہے کہ دنیا اور اسکی کل نعمتیں زوال پذیر ہیں۔ اور آخرت اور اسکی نعمتیں لازوال ہیں۔ مگر آدمی آخرت کی بات نہیں کرتا۔ کیا یہ قلب مریض نہیں؟ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصل موت قلب کا مریض ہونا ہے۔ جو موت مشہور ہے یہ تو ایسی ہے کہ جان گئی کہ جس طرح آدمی ایک کمرہ سے

دوسرے کمرہ میں چلا گیا۔ اگر دل زندہ ہو تو قبر میں جانے کے بعد زندہ ہے کیونکہ اس کا دل ایسی زندگی لے گیا ہے جو لازوال ہے یعنی اخروی زندگی۔ ھل یستوی الاحیاء والاموات کہ ایمان والے جو زندہ ہیں وہ اور کفر والے برابر ہوسکتے ہیں۔ آج ایسے آدمی کے سامنے میز بچھا ہے لاکھ کھانے پڑے ہوں یا آسمان پر اڑ رہا ہو اللہ تعالیٰ نے اس کا نام مردہ کی صفت میں لکھ دیا ہے۔ مثل الذی یذکر ربہ والذی لایذکر کمثل الحی والمیت۔ حدیث ذاکر و شاکر ہونے کے بعد صوفیاء کرام اس چیز کو حقیقت کہتے ہیں۔ بہرحال جب قلب صحیح کام نہ کرے تو کان وغیرہ بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔ تولایؤمنون کہ ایمان نہ لائیں گے ختم اللہ علی قلوبھم الخ۔ کہ دل ایسے بیمار ہوئے کہ حق نہ مانیں گے۔ وعلی سمعھم کہ حق کو سنیں گے بھی نہیں۔ اور آنکھوں پر پردہ ہے کہ حق کو دیکھ بھی نہ سکیں گے۔

درس نمبر۴
11 ستمبر 1966ء

مسئلۂ تقدیر

اس سے پہلے درس میں بیان تھا کہ جو لوگ بد قسمتی کی وجہ سے ایمان سے محروم ہیں اور اس محرومی پر مرینگے۔ ان کے متعلق ارشاد ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر حق قبول کرنے سے مہر لگائی ہے۔ اور حق دیکھنے سے آنکھ پر پردہ اور حق سننے سے کانوں پر مہر لگادی۔ یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے۔

شبہ

اللہ تعالی کا ارشاد ہے ان الذین کفروا سواء علیھم ائنذرتھم لخ۔ کہ ڈرائے یا نہ ڈرائے ایمان نہیں لائیں گے تو ایمان نہ لانا ممکن ہو گیا۔ کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے اور سچا ہے جب ایمان نہ لانے میں وہ معذور ہو گئے۔ تو وہ محشر میں کہیں گے کہ اس لئے ہم ایمان نہ لا سکے۔ حالانکہ میدان حشر میں کوئی شخص معذور نہ ہو گا۔

جواب شبہ

اللہ کا یہ ارشاد ہے لایؤمنون تو اس ارشاد سے ان کی معذوری ثابت نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی مریض ڈاکٹر کے زیر علاج ہو۔ تو ڈاکٹر نے علاج اور پرہیز تجویز کی۔ لیکن وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے خلاف بدپرہیزی کرتا ہے تو ایسی صورت میں انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ بیماری عروج پر آجاتی ہے تو جب ڈاکٹر صاحب دوبارہ معائنہ کرتا ہے اور مرض کی علامات کو دیکھ کر حکم لگاتا ہے کہ لایصح کہ یہ مریض درست نہ ہوگا۔ یعنی مرض لاعلاج ہو گئی۔ تو ہر عقلمند یہ سمجھتا ہے کہ اس کو لاعلاج ڈاکٹر کے کہنے نے نہیں کیا۔ بلکہ اس کی بدپرہیزی کی وجہ سے ڈاکٹر کو کہنا پڑا کہ یہ مرض لاعلاج ہے۔ تو معلوم ہو گیا کہ ان کفار کی بھی یہی حالت ہے۔

کفار کی قسمیں

کفار کی کچھ ایسی قسمیں ہیں کہ حق کی عداوت میں کچھ بہت کام کرتے ہیں تو پھر معاملہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اصلاح پر لانا ممکن نہیں ہوتا۔ جس طرح بقول بعض حضرات کے کہ بھارت اور پاکستان یا چین اور امریکہ کی عداوت جب اس حد تک پہنچ

گئی ہے تو صلح کے سارے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ تو حق کے ساتھ کفار کی دشمنی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ صلح ممکن نہیں تو اس وقت اللہ نے فرمایا ان کی اندرونی اور بیرونی حالت کو دیکھ کر فرمایا کہ لایؤمنون ان لوگوں کو ایمان نصیب نہ ہوگا۔ یعنی ایمان نہ لائیں گے ڈاکٹر اور مریض کی مثال بھی بعینہ ایسی ہے اگر ان کی باطنی استعداد حق و باطل کے ساتھ اتنے درجہ تک نہ ہوتی تو اللہ تعالی ہرگز لایؤمنون نہ کہتے۔ تو معلوم ہو گیا کہ خبر دینے سے لایؤمنون نہیں ہوئے بلکہ ان کے عمل کی وجہ سے لایؤمنون کہنا پڑا۔ اگر وہ بے ایمانی کی سرحد کو نہ پہنچتے تو اللہ بجائے لایؤمنون کے یؤمنون کہتے فرض کر لو کہ ایک آدمی بہاول پور میں مر گیا تو ہم کہتے ہیں کہ فلاں مر گیا وہ ہمارے اس کہنے سے نہیں مرا بلکہ اس کے مر جانے کے بعد ہم نے کہا کہ وہ مر گیا۔ تو ہمیشہ بول واقعہ پیدا نہیں کرتا بلکہ واقعہ بول پیدا کرتا ہے۔

دوسرا شبہ

کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ ہدایت قلب یا کان یا آنکھ کے راستہ سے آتی ہے۔ ختم اللہ علی قلوبھم اللہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ سب دروازے بند ہیں تو دروازہ بھی خود بند کیا اور پھر

فرمایا ولہم عذاب عظیم۔ کہ ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔

جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان والا صرف اللہ کے بول کو دیکھتا ہے مگر آج کل بے علمی کا دور ہے اس لئے تشریح کرتا ہوں ارشاد یہ ہے کہ ہر عضو کو بیماری لاحق ہوتی ہے قلب کو بھی مرض لاحق ہوتی ہے۔ کلا بل ران علی قلوبہم ما کانوا یکسبون۔ قرآن کا یہ کمال ہے کہ اگر ایک جگہ آیت بلا تشریح آئی ہے تو دوسری جگہ باتشریح بیان کر دیتا ہے۔ بل ران علی قلوبہم ما کانوا یکسبون۔ ان کے قلب پر زنگ لگ چکا ہے جو کچھ وہ کرتے تھے۔ اس آیت کے سلسلہ میں کچھ حدیث ہے اور حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی تشریح ہے کہ اللہ نے انسانی دل کو ایک خاص شکل دی ہے۔ یہ نہیں کہ انسان عمل کر کے ختم کرے تو شکل بھی ختم ہو گئی۔ نہ بلکہ اس نیکی نے قلب اور روح پر ایک روشنی پیدا کی۔ جو کسی حالت میں نہیں جاسکتی۔ تو خود عمل پائیدار ہے اور اس کا نور پائدار ہے۔ ہر نیکی اور بدی قلب پر ایک تاریکی اور روشنی کا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ تو جب اللہ سے سرکشی کا عمل کیا تو دل پر سیاہ نقطہ لگتا گیا تو یقینی بات ہے کہ جب تک روحانی طریقہ پر دل مکمل کالا ہو جائے تو ہدایت بند

ہو جاتی ہے۔ اور بندش کس وجہ سے ہوئی ان کے بداعمال کی وجہ سے ہوئی۔ بخاری و مسلم شریفین اذا اذنب العبد نقطت فی قلبہ سوداء فان تاب واستغفر طہر قلبہ والاصار کالکوز۔ جب انسان گناہ کرے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر توبہ کرے تو دھل جاتا ہے اگر نہیں تو اس کوزئے کی طرح ہو جاتا ہے جس کو آگ پر رکھو تو اس کے نیچے والے حصہ کی طرح دل بھی کالا ہو جاتا ہے۔ ہمارے دل میں جو نور ہے وہ قلب ہے تو اللہ تعالی نے اس کی دھلائی کا انتظام کیا کہ استغفار کرو تو دھل جائے گا۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر غلطی سے گناہ کیا تو سیاہ نقطہ نہیں پڑتا۔ تو سوال یہ ہے کہ مہر کب لگی اور کیوں لگی۔ تو دنیا میں تمام چیزوں کے نتائج معلوم ہیں۔ کہ آدمی نے زہر کھائی تو مر گیا۔ مارنے والا اللہ ہے مگر زہر کھائی تو اللہ تعالی نے مار دیا۔ تو ختم اللہ کب فرمایا جب وہ جرائم کرتے کرتے آخری حد تک پہنچ گئے تو یہ فرمانا ہی پڑا لا یؤمنون کہ ایمان نہیں لائیں گے۔

ابھی دیکھو کہ ترکی کے سابق صدر جمال گرسل کو نزع کی حالت لگے ہوئے چھ ماہ[سلہ] ہو گئے ہیں کہ جان نہیں نکلی یہ عالم دنیا میں[سلہ۲] گذر گئے مگر اللہ تعالی اس کی جان نہیں نکالتا تو نہ جانے کس گناہ میں پکڑا ہوا ہے ایک بات یہ ہے کہ وہ یورپ کا دلدادہ تھا ترک مسلمانوں کو مغربی رنگ میں ڈھالنا چاہتا تھا ممکن ہے کہ اس کے

سلہ اور گیارہ دن ہوگئے ہیں مگر جان نہیں نکلی

سلہ۲ نزع کی حالت تاریخ انسانی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ آج چھے ماہ گذر

اندر نفس ایمانی کی وجہ سے یہ تکلیف ہوتا کہ وہ ڈھل جائے اور جنت کا مستحق بن جائے۔ ایک آدمی نے کہا کہ کافر پر خدا کی کوئی پکڑ نہیں۔ میں نے کہا کہ پھانسی والے کیلئے کوئی قانون نہیں کہ اگر وہ روزانہ صدر پاکستان کو گالی دیتا رہے تو اس کیلئے کوئی قانونی گرفت نہیں۔ اسی طرح کفار بھی پھانسی والے ہیں ان کو دیگر جرائم میں پکڑنے کی کیا وجہ ہے مگر ہم سے اب تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ یورپ سچا ہے یا اللہ حق پر ہے۔ کارخانہ جات وغیرہ کی بات نہیں بس یورپ کی ہر وہ بات جو اللہ سے ٹکراتی ہو تو اس کو چھوڑ دو۔ تو ختم اللہ علی قلوبہم الخ۔ کہ مہر اسباب کے بعد لگتی ہے اسباب سے پہلے نہیں لگتی۔ زہر کھانے والے کو زہر کھانے سے پہلے موت نہیں آتی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے ختم اللہ علی قلوبہم الخ۔ کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قلب، کان، آنکھ میں ایک طاقت ڈالی تھی کہ انسان حق جانے اور ہر طاقت اللہ تعالیٰ کی بخشش ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی بخشش بیجا استعمال ہو تو اللہ تعالیٰ نعمت چھین لیتا ہے۔ فرض کرلو ایک امیر آدمی کسی غریب آدمی پر مہربان ہے وہ اس کو ماہانہ سو روپیہ دیتا رہتا ہے مگر وہ آدمی وہی پیسے اس کے خلاف استعمال کرتا ہے اگر اس بات کا علم اس امیر شخص کو پہنچ جائے کہ یہ امر بار بار مستعمل ہو چکا ہے تو وہ اس نعمت کو بند کر دیتا ہے۔ تو کیا یہ اس نمک حرام دوست کے غلط

کام کی وجہ سے بند ہوا ہے؟ یا اس امیر آدمی نے خود بند کر دیا ہے۔ اسی طرح وہ کفار بھی کہ اللہ تعالیٰ نے حق کی نعمت قلب، کان اور آنکھ میں رکھی مگر وہ انہیں غلط استعمال کرتے تھے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو تکلیف دیتے تھے۔ انہوں نے اللہ کی نعمت کو اللہ تعالیٰ کی دوستی کی بجائے دشمنی میں استعمال کیا۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا۔ ختم اللہ علی قلوبھم الخ۔ کہ ہم نے نعمت چھین لی کیونکہ انہوں نے نعمت کی بے قدری کی ہے۔ یہ مہر علم کے باوجود بھی آدمی کو لگ جاتی ہے۔ ایک بار ایک کالج والوں نے بلایا کہ یہاں خدا کے انکار کرنے والے بہت ہیں آپ خدا تعالیٰ کے بارے میں تقریر کرنا۔ تو اس تقریر میں میں نے مرغی اور انڈے والی مثال دی کہ عین وقت پر بچہ اندر سے اور ماں باہر سے چوٹ لگاتی ہے۔ الہام الٰہی کے ذریعہ سے یہ بیان کر رہا تھا کہ ایک سائنس کے پروفیسر صاحب نے ایک پرچہ دیا کہ جناب آج کل سائنس میں جدید تحقیق ہوئی ہے کہ ماں بھی چوٹ مارتی ہے لیکن جب بچہ انڈہ میں مکمل طور پر پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے سر پر ایک باریک سا سینگ پیدا ہو جاتا ہے اور بچہ نکل آنے کے ساتھ سینگ ختم ہو جاتا ہے اگر ختم نہ ہوتا تو ماں کے سینے کے نیچے آ کر اسے نقصان پہنچاتا۔ میں نے کہا اس سے میری دلیل اور پختہ ہو گئی۔ تو میں نے کہا کہ یہ کام کس نے کیا کہ بچہ کو سینگ کس نے

دیا- ایک تو خاص چونچ کے مقام پر پھر اس سے کام لیکر اس کو ختم کس نے کیا- میں نے کہا سائنس میں جتنی توجیہات کرو گے آخر اللہ ہی پر بات آئیگی- یورپ والے ان تمام عجائبات قدرت کو دریافت کرنے کے باوجود خدا تعالےٰ کو نہ پا سکے تو معلوم ہو گیا ختم اللہ علیٰ قلوبہم الخ کہ مہر لگ چکی ہے- اَفَرَئیتَ مَنِ اتخذ الٰہہٗ ھواہُ اے انسان تو نے ان کو دیکھا جنھوں نے اپنی خواہش کو خدا بنایا ہوا ہے- آج یہ مرض مسلمانوں میں بھی پھیل گیا ہے- کہ اللہ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا مسلمانوں میں دولت اور دنیا کی محبت آ گئی- یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا پورا معاشرہ دین سے کٹ کر دنیا میں مٹ گیا- دنیا کی محبت اسقدر پھیل گئی ہے کہ قلب میں اللہ اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کیلئے کوئی خانہ خالی نہ رہا- اَفَرَئیتَ مَنِ اتخذَ اِلٰہہٗ ھَوَاہُ- وَاَضلّہ اللہ عَلیٰ علمٍ وَختم عَلیٰ سَمعِہٖ وَقلبِہٖ وَ جَعَلَ عَلیٰ بصرہٖ غشاوۃ فمَن یھدیہ مِن بعد اللہِ افلاَ تذکّرون وَقَالوُا مَاھِیَ اِلاّحیاتنا الدنیا نموتُ ونحیٰ وَمَا یُھلکنا اِلاّالدھرُ وَمَا لھُم بذٰلک مِن علمٍ اِن ھُم اِلاّیظنّون- (اور ہمیں زمانے کی گردش ہلاک کرتی ہے) یہ سورۃ جاشیہ کی آیت ہے- اگر ھدایت کی خداداد نعمت جو قلب- کان اور آنکھ کو ملی ہے اسے غلط استعمال کیا تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا وہ چھن گئی- یہ ان کے فعل کی وجہ سے چھن گئی ہے نہ کہ اللہ تعالےٰ نے خود چھینی ہے- دنیا میں جو تمام افعال ہوتے ہیں وہ تین چیزیں ہیں 1- کائنات عرش

سے فرش تک، 2۔ صفات کائنات مثلاً سورج کی گرمی و روشنی سورج کی صفت ہیں، 3۔ افعال انسانی سب لوگ اور انسانیت متفق ہے کہ پوری کائنات و صفات کائنات اللہ تعالےٰ کی بنائی ہوئی ہیں۔ اور افعال کی دو قسمیں ہیں۔ اختیاری اور غیر اختیاری۔ غیر اختیاری کے بارے میں سب کا فیصلہ ہے کہ وہ بھی اللہ تعالےٰ کے بنائے ہوئے ہیں۔ اور اختیاری کہ نماز پڑھنا اور زکوۃ دینا وغیرہ۔ اس کے متعلق ہے کہ یہ ہم پیدا کرتے ہیں یا اللہ تعالےٰ پیدا کرتا ہے؟ اس میں تین رائے ہیں کہ مؤمن کا نیک عمل اور کافر کا بد عمل۔ مطلب یہ کہ اللہ کا ارادہ بندہ سے ایسے فعل کرواتا ہے جس طرح قلم لکھنے والا پھیرتا ہے۔

صوفیاء کرام کا ایک گروہ ہے اور یورپ کے اونچے درجہ کے جو فلاسفر ہیں۔ جبریہ ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ بندہ کی قدرت کو افعال میں دخل نہیں بلکہ اللہ ہی کرواتا ہے۔ معتزلہ کا گروہ یہ کہتا ہے کہ اللہ کو دخل نہیں بندہ کرتا ہے۔ یہ ہے قدریہ۔ مگر اہل سنت بین بین ہیں اس کی تشریح دوسرے درس میں ہوگی۔ حضرت علیؓ کی مجلس میں ایک شخص آیا کہ ہم بااختیار ہیں کہ نہیں۔ فرمایا ایک پاؤں اٹھاؤ۔ اس نے اٹھا لیا پھر فرمایا دوسرا پاؤں اٹھاؤ اس نے عرض کیا کہ یہ نہیں ہو سکتا اس پر فرمایا کہ پہلا کام اختیار ہے اور دوسرا جبر۔

درس نمبر ۵
16 ستمبر 1966ء

اَفعال انسانی کی تخلیق وتقدیر

یہ دو مسئلے ترتیب سے بیان ہوں گے۔

(1) انسانی افعال کی تخلیق۔ کہ کوئی انسان جو فعل و عمل کرتا ہے ان کا خالق کون ہے۔

(2) انسانی افعال کی تقدیر۔ کہ انسان جو فعل کرتا ہے وہ تقدیر میں طے شدہ ہے کہ نہیں۔ پہلا مسئلہ کہ انسانی اعمال و افعال کا کون خالق ہے۔ تو یہاں دو چیزیں ٹکراتی ہیں۔ اس لئے یہ مسئلہ نہ صرف اسلام میں بلکہ پورے مذاہب میں مشکل بن گیا ہے۔ اگر یہ شکل اختیار کیجاتی ہے کہ بندہ جو فعل و عمل کرتا ہے وہ خدا ہی کرتا ہے اور بندہ کو کوئی دخل نہیں تو پھر جزاء و سزا کا سلسلہ عدل الٰہی کے خلاف ہے۔ اور اگر یہ ہو کہ سب کچھ بندہ کرتا ہے اور اللہ تعالےٰ کو کوئی دخل نہیں تو اللہ تعالےٰ کی عظمت پر دخل پڑتا ہے کہ خدائی اللہ کی ہے اور بندہ جاہے جو کچھ کرتا رہے۔ یہ تو غلط ہے۔ کیوں یہ اللہ کی حکومت کے خلاف ہے۔ تو اس لئے اس مسئلے کا حل

دشوار ہوا۔ امام رازی رحمتہ اللہ جیسے عالم نے اس آیت ختم اللہ علی قلوبہم الخ کی تفسیر میں پورے غیر مذاہب کا جواب دیا ہے۔ اور آگے چل کر فرماتے ہیں کہ مجھے اس مسئلہ کی کوئی خبر نہیں بس اللہ ہی جانتے ہیں۔ بس صرف اللہ تعالیٰ کے فرمان کے بعد ہماری دلیل کوئی معنی نہیں رکھتی دیکھو حقیقت میں یہ ہے کہ کیا قلی اور مزدور کسی فلاسفر کی بات سمجھ سکتے ہیں؟ تو اگر کچھ باتیں ہماری عقل نہ آئیں ہماری سمجھ نہ آئیں تو یہ کہنا کہ یہ غلط ہیں بلکہ ہماری عقل ناقص ہے۔ جمع الفوائد کی حدیث پاک ہے کہ جو ان دو مسئلوں میں بلا تحقیق ایمان لائے گا وہ جنت میں جائیگا۔ اگر تحقیق کی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی تحقیق ہو گی۔ تو بلا تحقیق ماننے میں فائدہ ہے۔ آج کل انسان عمل کرنے کی خاطر مسائل نہیں پوچھتے بلکہ دماغی فرحت کی خاطر مسئلہ تقدیر وغیرہ پوچھتے ہیں۔ کما ان للبصر حداً لا تتجاوزہ کذالک للعقل حداً لا یتجاوزہ۔

یہ دعویٰ کرنا کہ ہماری عقل کی پہنچ ہر جگہ ہو گی۔ یہ غلط ہے۔ ہم بھی اس آیت کی تفسیر میں نہ پڑتے مگر آج کل عقیدہ بگڑنے کا خطرہ ہے اس لئے وضاحت کرتا ہوں۔ لیکن آپکو ایک خاص مسئلہ واضح کرتا ہوں کہ تقدیر اور افعال کا خالق۔ یہ دونوں اسلام کے مسئلے ہیں۔ صرف مولوی سے پوچھنا چاہیئے؟ نہیں بلکہ ہر مذہب والوں سے پوچھنا چاہیئے۔ یہ دہریہ منکر خدا یہود وغیرہ سب کے ذمہ

ہے۔ مطلب یہ کہ جو کوئی پوچھے ہم اسے یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ بھی اسے حل کر دو۔ دہریہ کے سلسلہ میں ایک قصہ ذکر کروں۔ علیگڑھ کالج میں ایک مسلم سائنس دان تھا اس کو سائنس کے مطالعہ نے ایسے فلسفہ پر پہنچایا کہ خدا تعالیٰ کا انکار کرنے لگا۔ تو اسے معلوم تھا کہ انکار نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ علم یورپین ممالک کا ہے۔ تو وہ میرے پاس دارالعلوم دیوبند آیا یہ عصر اور مغرب کا درمیانی وقت تھا۔ میں نے کہا کہ وقت تو بہت تنگ ہے اس لئے اسلام کے خلاف جو سب سے بڑا مشکل سوال ہو وہ آج بیان کریں باقی کل کر لیں گے۔ تو اس نے یہی تقدیر اور افعال کا خالق والا کیا۔ تو وہ فلسفی تھا اور (1) فلسفہ بغیر علت و سبب کے بیان نہیں ہو سکتا ایک تو یہ اور (2) دوسرا فلسفہ کیلئے قانون یہ ہے کہ ایک چیز اگر ایک مکان میں ہے اور اگر وہ دوسرے مکان میں ہو تو اس کے لئے خاص سبب کی ضرورت ہے اور رکھنے والے نے رکھا ہے (3) اور فلسفہ کیلئے تیسرا قانون یہ کہ ایک چیز کسی مختلف زمانہ میں ہو سکتی ہے۔ تو خاص جگہ پر ہونا یہ بھی کسی خاص سبب کیوجہ سے ہوتا ہے۔ جس طرح آپ روزانہ مسجد میں آتے ہیں مگر جمعہ اور اتوار کو خاص درسِ قرآن کیوجہ سے آتے ہیں۔ میں نے کہا کہاں سے تشریف لائے۔ کہا علیگڑھ سے میں نے کہا کب تشریف لائے کہا کہ فلاں دن۔ میں نے کہا کہ علیگڑھ سے آنا یہ ایک حرکت ہے۔ آپ خاص اس دن

کیوں آئے کسی دوسرے دن آ جاتے۔ کہا کہ دہلی علاج کروانے کیلئے۔ میں نے کہا کہ بیماری کیوں ہوئی۔ کہا کہ فلاں چیز کھائی تھی۔ میں نے کہا کہ وہ چیز آپ اس وقت کے علاوہ اور وقتوں میں بھی کھا سکتے تھے۔ تو کیوں جو اس کے پیچھے لگا تو گھبرا گیا۔ کہنے لگا کہ اس طرح تو کیوں میرا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ تو دس منٹ بعد کہنے لگا کہ میرا پہلا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ یعنی خدا کا قائل ہو گیا۔ کیونکہ کیوں کا جو دور چلا تھا۔ آخر یہ خدا تک جا پہنچتا اس لئے مان گیا۔ تو اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ سوالات روس کے دہریہ وغیرہ سے بھی کر سکتے ہیں۔ کہ یہ کام کیوں ہوا وغیرہ۔ تو تمام منکرینِ خدا۔ و محبینِ خدا کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر مسئلہ کو دیکھیں کہ اسکی آخری کڑی کہاں جا پہنچتی ہے۔ تو یہ مسئلہ عقلی و نقلی دونوں اعتبار سے مشکل ہے۔ نقلی اعتبار ان الذین امنوا و عملوا الصلحت الخ کہ جو نیک عمل کرتے ہیں وہ کامیاب ہیں۔ اس آیت میں اعمال۔ انسان کی طرف منسوب ہیں۔ اور کچھ آیتیں ایسی ہیں جن میں ہم پر خدا کی حکومت قائم ہے۔ واللہ خلقکم وما تعملون۔ کہ اللہ نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو بنایا ہے۔ اور کچھ آیتوں میں دونوں موجود ہیں ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ کہ عبادت بھی تیری کرتے ہیں اور مدد بھی تم سے مانگتے ہیں۔ تو ایک ہیں جبریہ مثلاً یورپ کے اونچے درجہ کے جو فلاسفر ہیں وہ کہتے ہیں کہ بندہ جو کچھ کرتا ہے وہ اللہ کے حکم سے کرتا

ہے اور بندہ کو کوئی دخل نہیں۔ صوفیاء کی اکثر تعداد اسی عقیدہ میں ہے۔ جبریوں نے اس میں اللہ تعالےٰ کی عظمت سمجھی۔ ان کل من فی السموٰت و الارض الخ اس بات کو ہر ایک مانتا ہے کہ پوری کائنات کا خالق اللہ تعالےٰ ہے۔ باقی رہا کہ انسان کے فعل و عمل کا کون خالق ہے۔ تو یہ تو قطعی فیصلہ ہے کہ انسان کے غیر اختیاری اعمال اللہ تعالےٰ نے پیدا کئے ہیں۔ اور باقی رہ گئے اختیاری اعمال ان کی پیدائش بھی اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔ معتزلہ نے کہا کہ افعال کا خالق صرف بندہ ہے اللہ تعالےٰ کو کوئی دخل نہیں۔ یہ دونوں غلط ہیں۔ تو غلطی میں زیادہ جبریہ فرقہ ہے۔ مثلاً آپ کسی گلی سے گذریں اور کتا تم پر بھونکے۔ تو کتا پتھر مارنے پر مارنے والے کے پیچھے دوڑے گا نہ کہ پتھر کے پیچھے تو کتے کو بھی اس قدر شعور ہے کہ اختیار مارنے والا رکھتا ہے۔ تو جانور بھی یہ سمجھتا ہے کہ مارنے والا اپنے اختیار سے مار رہا ہے۔ ایک آدمی نے اعتراض کیا کہ بعض کتے پتھر کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ کچھ آیتیں جبریہ کی غلطی میں ہیں اور کچھ آیتیں معتزلہ کی غلطی میں ہیں۔ جبریہ نے عظمت کو لیا اور عدل کو نظر انداز کر دیا۔ معتزلہ نے عدل کو لیا اور عظمت اللہ کو ترک کیا۔ اور اسلام کے صحیح مذہب میں ہمارے تصور، ارادہ کو اور خدا کے ارادہ کو بھی دخل ہے اس لئے اللہ تعالےٰ کی الٰہی بدستور ہے۔ میں کچھ آیات کا ذخیرہ پیش کرتا ہوں کہ ہم اللہ تعالےٰ کی خدائی

سے خارج نہیں۔ واللہ خلقکم و ما تعملون۔ خلق کل شیٍٔ فقدرہ تقدیرا۔ افمن یخلق کمن لایخلق۔ آگے چل کر حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد گرامی سے اس معاملہ کو طے کیا۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ فرمایا حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اناما اصابک لم یکن لیخطئک۔ دنیا میں جو تکلیف تجھے پہنچی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ تم کو نہ پہنچتی۔ اور جو تیرے ہاتھ نہ آئی یہ ممکن نہیں تھی کہ تیرے ہاتھ میں آتی ولومتَّ

اور جو اس عقیدہ کے خلاف مر جائے گا وہ جہنم میں جائیگا۔ تو اس سلسلہ میں کہ صحابہ کرامؓ نے اس کو کیسے سمجھا۔ اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو صحابہ کرامؓ کا اس مسئلہ پر پہنچنا ہم تک نہ پہنچتا۔ تاریخ ابن خلدون میں ذکر ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے ایک مرتبہ شام کے علاقہ کا دورہ کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ ملک اس وقت عیسائیوں کا تھا تو سواری کیلئے ایک اونٹ ہے اور ایک غلام بھی ساتھ ہے تو منزل بمنزل تبدیل ہوتے گئے۔ کیا آج کا ڈپٹی کمشنر ایسا کریگا؟ یہ تو آج کا پٹواری بھی نہ کریگا۔ تو بیت المقدس کی چابی لینے کے وقت ہزاروں کی تعداد میں عیسائی شہر کے باہر کھڑے تھے۔ تو اس وقت اونٹ پر سواری کی باری غلام کی تھی۔ تو غلام نے کہا کہ آپ سوار ہوجائیں فرمایا کہ ہماری عزت ایمان کی وجہ سے ہے۔ نہ کہ اونٹ کی سواری سے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ عیسائیوں نے ہتھیار

ڈالدئے اور کہا کہ آپ صلح کیلئے جو کچھ کہیں گے ہم وہی مانیں گے پوچھا گیا کہ اتنی جلدی ہتھیار کیوں ڈالدئے کہا ہماری کتابوں میں ذکر ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا صحابیؓ اپنے غلام کو اونٹ پر سوار کر کے بیت المقدس آئیگا۔ تو بات مسئلہ کی ہے۔ کہ جب بیت المقدس کا صلح نامہ مکمل طور پر طے ہوگیا تو جہاں حضرت فاروق اعظمؓ تشریف لیجانا چاہتے تھے تو وہاں کسی مرض کی وبا پھیلی ہوئی تھی تو سیدنا فاروق اعظمؓ نے مشورہ لیا۔ وشاورھم فی الامر۔ یہ ارشاد حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہے جو پورے جہان سے بڑھکر تھے۔ یعنی آپکو بھی مشورہ کا حکم ہے۔ تو سپہ سالار حضرت ابوعبیدہؓ نے وبا کی اطلاع دی کہ جہاں آپ جانا چاہتے ہیں وہاں تو وبا پھیلی ہوئی ہے وہاں سے ہزاروں جنازے اٹھتے ہیں۔ تو آپنے مہاجرین سے رائے لی ان کے دو گروہ ہوگئے ایک جانے کا مشورہ دے اور دوسرا نہ جانے کا۔ پھر آپ نے انصار سے رائے لی ان کے بھی دو گروہ ہوگئے۔ پھر آپ نے ان سے مشورہ لیا جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے انہوں نے متفقہ فیصلہ دیا کہ آپ نہ جائیں تو فاروق اعظمؓ نے فرمایا میری رائے متفقہ فیصلے کے موافق ہے۔ یہ فیصلہ سرغ کے مقام پر ہوا تو حضرت ابوعبیدہؓ نے جملہ کہا افر من تقدیر اللہ کہ تم اللہ کی قدرت سے بھاگتے ہو۔ آپ نے فوراً فرمایا ہم ایک تقدیر سے دوسری تقدیر کیطرف بھاگتے ہیں۔ پھر مثال فرمائی کہ جو

شخص سر سبز ٹکڑے میں اونٹ چرائیگا کیا وہ اللہ کی تقدیر سے چرائیگا یا اللہ کی تقدیر کے خلاف۔ کہا کہ اللہ کی تقدیر سے۔ اور جو زمین کے خشک حصہ میں اونٹ چرائیگا تو کیا یہ تقدیر الٰہی کے ما تحت چرائیگا یا کہ نہیں؟ کہا ہاں خداتعالےٰ کی تقدیر کے تحت چرائیگا۔ تو اپنی مرضی سے زمین کے کون سے حصہ میں اونٹ چرائیگا۔ کہا کہ سر سبز علاقہ میں۔ تو اس پر سیدنا فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ میں سر سبز علاقہ میں جا رہا ہوں۔ دیکھو سیدنا حضرت عمرؓ کا خیمہ نہ تھا صرف ایک کمبل تھا۔ نیچے بچھاتے تو کمبل اور اگر درخت پر لٹکاتے تو خیمہ بن جاتا۔ باقی دوسرے درس میں بیان کرونگا۔

درس نمبر ۶
18 ستمبر 1966ء

مسئلۂ تقدیر

اس سے پہلے درس میں اس مسئلہ کا بیان ہوا کہ انسان جو فعل کرتا ہے۔ اسے خود پیدا کرتا ہے یا خدا تعالےٰ پیدا کرتا ہے۔ تو اس میں کچھ حصہ بندے کا ہے اور کچھ حصہ خدا کا ہے۔ جبریہ ایک گروہ ہے وہ کہتا ہے کہ سب کچھ خدا تعالےٰ کرتا ہے۔ بندے کا اس میں کوئی تعلق نہیں۔ مادی طبقہ کہتا ہے کہ سب کچھ بندہ کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کا اس میں کوئی تعلق نہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ کچھ حصہ بندے کا ہے اور کچھ حصہ خدا تعالےٰ کا ہے۔ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ عقل عاجز ہے۔ بندہ جو فعل کرتا ہے اگر وہ سب اللہ تعالےٰ کا حصہ ہے تو بندے کو سزا کیوں ملتی ہے تو پھر تعزیری جرم فضول ہیں۔ عدالتیں بے کار نہیں۔ تو عقل نے یہ فیصلہ دیا کہ اس میں انسان کو کوئی دخل ہے۔ لیکن عقل نے دوسرا فیصلہ یہ کیا کہ انسان کے ذمہ تب ہے کہ وہ ایک ایک ذرہ سے واقف ہو۔ جو نہیں۔ مثلاً خط لکھنے والا اگر حروف تہجی، کلمہ، فعل وغیرہ یعنی گرائمر

نہیں جانتا تو وہ کیسے خط لکھے گا۔ انسان جو فعل کرتا ہے اس کا نام حرکت ہے اور انسان اپنی ہر حرکت سے واقف نہیں۔ اس سلسلہ میں اس کا دل کچھ کاروائی کرتا ہے۔ کہ وہ خیال کرتا ہے۔ کچھ اس کے پاؤں کرتے ہیں کہ وہ چلتے اور مڑتے پھرتے ہیں۔ پھر باقی اعضاء کا حصہ ہے کہ وہ اپنی اپنی جگہ حرکت کرتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ گھر سے مسجد تک آتے ہوئے کتنے قدم چلا۔ اس کے پاؤں کتنے بار مڑے اور کتنے بار سمٹے۔ کتنے بار اسے خیال آیا۔ کیا اس کا مستقل ارادہ تھا یا وہ ایسے ہی چلا گیا۔ انسان اپنے اعمال و افعال سے ہمہ گیر یعنی مکمل واقف نہیں۔ اسی طرح الہٰی کتب میں نقل کے اعتبار سے اٹل فیصلہ ہے۔ اللہ تعالےٰ نے کبھی پہاڑ، دیوار کو نہیں کہا کہ ایمان لایا۔ یہ صرف انسان کیلئے کہا گیا جہاد، کفر، نیک و بد، خیر و شر میں صرف انسان کو مخاطب کیا۔ باقی چیزوں کو نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو اپنے اپنے اعمال میں دخل ضرور ہے۔ ابھی کا واقعہ ہے کہ ایک تعلیم یافتہ خاتون نے دوسری عورت کو کہا کہ تم فلاں دن راولپنڈی آجانا میں بھی پہنچ جاؤنگی۔ تو دوسری خاتون نے کہا کہ انشاء اللہ کہو تو اسنے جواب دیا (نعوذ باللہ) انشاء اللہ کہنا مجھے ناگوار گذرتا ہے۔ یہ ہے آج کی تعلیم کا اثر۔ ہم تو جو کچھ ہیں ہی سہی ہمارے ہادیِ اکبر صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی تو حکم ہے کہ انشاء اللہ فرمایا کریں۔ ایک دفعہ کفار نے مسلمانوں سے کہا کہ

حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے تین سوال پوچھیں۔ (1)ذوالقرنین کے متعلق (2)اصحاب کہف کے متعلق (3)روح کی بابت۔ آپ نے فرمایا کل جواب دونگا۔ انشاءاللہ نہیں فرمایا بھول گئے۔ تو کئی دن گذر گئے اللہ تعالٰے کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا آپ بہت پریشان ہوئے۔ کئی دن بعد وحی آئی۔ پہلے دو قصے تفصیل سے بیان ہوئے مگر تیسرے کی بابت جواب ملا کہ اس کا علم صرف اللہ تعالٰے کو ہے۔ آج تو انشاءاللہ کہنا ناگوار گذرتا ہے حالانکہ یہ انسان کا ضروری جزو ہے مگر حیرت کی بات ہے کہ انسان کو اس کا علم نہیں۔ اس کے ساتھ کہا گیا کہ اے پیغمبر مت کہیں کوئی بات آئندہ کرنے کی مگر انشاءاللہ ضرور کہیں۔ یہ اس لئے فرمایا کہ فرض کیا کہ ہم نے پورے اسباب تیار کئے۔ وہ کام بالکل تیار ہے تو نہیں ہو سکتا جب تک اللہ کا منشاء نہو۔ فرض کریں تحصیلدار کے عہدے کیلئے جو ڈگری لازمی ہے وہ بھی ایک امیدوار کے پاس ہے۔ کاغذات تیار ہیں۔ ڈپی۔ سی وغیرہ نے بھی سفارش کر دی مگر محکمہ عالیہ کیطرف منظوری ضروری ہے۔ بعینہ ہر کام کیلئے اللہ کی منشاء ضروری ہے۔ انسان کو خلق کی صفت عطا نہیں ہوئی۔ خلق کہتے ہیں کہ ایک چیز سو فیصد نہ ہو اور وہ چیز بنا لیں۔ جیسے ایٹمی ذرات دنیا میں موجودہ مواد سے بنائے گئے۔ موٹر کی مشینری لوہا سے تیار ہوئی اور لوہا دیگر ذرات سے بنایا گیا۔ وہ ذرات اللہ کے بنائے ہوئے

ہیں۔ اسی طرح ہائیڈروجن بم، ہوائی جہاز و دیگر ایجادات وغیرہ کیا اللہ کی مخلوق کی ہوئی چیزوں یا ذرات کی محتاج نہیں؟ انسان اللہ کی پیدا کردہ چیزوں کو موڑ توڑ کر سکتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو چند صفات عطا کی ہیں۔ (1) ارادہ کی صفت (2) علم کی صفت، انسان اور حیوان کو ارادہ کی صفات عطا کی ہیں۔ پانی بلندی سے پستی کی طرف اور آگ پستی سے بلندی کی طرف چلتے ہیں۔ اللہ نے صرف انسان اور حیوان کو ارادہ کی صفت عطا کی ہے۔ حیوان کا ارادہ صرف پیٹ کے گِرد رہتا ہے۔ بیل کا جوڑا، ہل وغیرہ انسان کی خدمت کیلئے ہے۔ بیل پیاسا تھا اس کے ارادہ کی صفت نے اسے ابھارا کہ پانی پی لو۔ اور بھوکا تھا تو ارادہ کی صفت نے کہا کہ فلاں گھاس کھا لو۔ گرمی سخت ہو تو صفت ارادہ اسے ٹھنڈی جگہ لے آتی ہے۔ مگر بیل کو جس مقصد کیلئے بنایا گیا وہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتا۔ بلکہ انسان اس سے جبری خدمت لیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جانور اپنے پیٹ کا کام تو اپنے ارادے سے کرتا ہے مگر جس کام کیلئے وہ پیدا ہوا وہ خود نہیں کر سکتا بلکہ انسان اس سے زبردستی لیتا ہے۔ مگر انسان اپنے پیٹ کا کام بھی اپنے ارادہ سے کرتا ہے اور دوسرے کام بھی اپنے ارادہ سے کرتا ہے۔ عبادت اپنے ارادہ سے کرتا ہے۔ دین نام ہے دل کی خوشی اور رضاء سے اللہ اور اسکے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو ماننا۔ گویا ارادہ کی صفت انسان خود کرتا ہے۔ ارادہ کی

دو صورتیں ہیں۔ (1) قصدِ مصمم (2) قصدِ غیر مصمم۔ پکا ارادہ وہ ہے
کہ جس کے بعد کام ہو جائے۔ کچا ارادہ وہ ہے جس کے بعد کام نہ
ہو۔ اللہ نے یہ ارادہ کیا کہ کائنات کا کارخانہ تو میری قدرت میں
ہے۔ مگر اتنا کرتا ہوں کہ انسان جب کسی کام کے ساتھ پکا ارادہ
کرے تو اکثر وہ کام پیدا کروں گا۔ مثلاً ایک آدمی نے درس میں
آنے کا قصد مصمم کیا تو گھر سے مسجد تک حرکت کیلئے فعل کی
تخلیق اللہ نے کی۔ خدا تعالیٰ پیاس بجھانا اور بھوک ہٹانا تخلیق کرتا
ہے۔ روٹی پکانے کیلئے آگ تخلیق کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قصدِ
مصمم کی تخلیق انسان کے بس میں دیدی۔ ایک بہت بھاری
پتھر موجود ہو اسے کہا جائے اسے ہٹاؤ لیکن ہاتھ مت لگاؤ اگر ہاتھ لگایا
تو پھر ہم اٹھائیں گے لیکن جواب تمہارا طلب کریں گے۔ بندہ اگر
قصد کرے اور پھر اس کا اختیار نہ ہو تو پھر عاجزی ہے۔ اللہ تعالےٰ
بندے کو عاجز نہیں رکھنا چاہتا بلکہ مختار بنانا چاہتا ہے اس لئے اسے
اختیار دیتا ہے کہ تم مصمم ارادہ کرو یہ کام ہو جائے گا۔ مگر کبھی کبھی
اسے توڑتا ہے۔ چونکہ اگر ایسا نہ کرتا تو انسان کو کام کیلئے اللہ کی
عاجزی نہ رہتی۔ تو معلوم ہوا کہ خیر و شر وغیرہ کی تخلیق تو اللہ
تعالےٰ کی ہے مگر قصد انسان کا کام ہے۔ اب پیدا کرنے والا بری
ہے اور کرنے والا پکڑا گیا۔ خالقِ اعمال خدا ہے۔ اور کاسب بندہ
ہے۔ کسب قصد کا نام ہے۔ دن کو سبز جھنڈی دکھائی جائے تو

گاڑی چلتی ہے کہ لائن ٹھیک ہے۔ مگر سرخ سے نہیں چلتی۔ اور رات کو سرخ اور سبز بتی سے کام لیا جاتا ہے۔ اب اگر سبز جھنڈی ہلائی اور آگے پلیٹ فارم پر دوسری کھڑی تھی گاڑیوں کی ٹکر ہوئی۔ حادثہ ہوا جھنڈی والا کہتا ہے کہ ڈرائیور نے انجن کو حرکت دی چلایا۔ گارڈ نے حکم دیا۔ تو اصل مجرم یہی دو ہیں۔ تو پھر ڈرائیور سے پوچھا گیا تو اس نے کہا میں کیا کرتا جھنڈی والا جھنڈی نہ ہلاتا تو حادثہ نہ ہوتا۔ اب یہ دیکھیں جھنڈی والا ایک طرف کھڑا تھا اس نے گاڑی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ مگر اصلی مجرم وہی ہے۔ اس طرح انسان اللہ کے اسباب کو اشارہ کرتا ہے کہ آمیدان ہموار ہے ارادہ پکا کر لیا گیا ہے اب تمہاری دیر ہے تو کام کے اسباب اور کام پیدا کرنیوالے کے مقابلہ میں بلانے والے کا زیادہ قصور ہے۔

درس نمبر ۷
23 ستمبر 1966ء

تقدیر و تدبیر

اس سے پہلے درس میں یہ بیان ہوا تھا کہ انسان جو کرتا ہے۔ تو پکا ارادہ بندہ کی طرف سے ہوتا ہے لیکن تخلیق اللہ کرتا ہے اور ذمہ داری قاصد پر ہے۔ میں نے ریل کی مثال دی تھی۔ اس معاملہ میں صحیح مسلک یہی ہے جو بیان ہوا البتہ باقی یہ رہ گیا کہ ہمارے افعال کا خالق خداتعالےٰ ہے۔ اس میں حکمت کیا ہے؟ اگر ہم اپنے افعال کے خود خالق ہوتے تو کیا نقصان ہوتا۔ پہلے درس میں جو کچھ بیان کیا گیا وہ حق مسلک تھا۔ اس میں حکمت کیا ہے؟ پہلے یہ کہ یہ کام عظمت خداوندی کے خلاف ہے کہ اس کے کارخانے میں اور اس کی حکومت میں کسی اور کی بات بھی چل سکے۔ یہ تو ایک گورنر بھی اتنا براشت نہ کرے گا کہ میرے دائرہ میں کسی اور کی بات چلے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ایک حکومت دوسری حکومت کے اندرونی معاملہ میں دخل دیتی ہے تو اس کو کہا جاتا ہے کہ یہ ہمارا اپنا اندرونی معاملہ ہے آپ کا کیا مطلب۔ تو یہ

بین الاقوامی قانون ہے۔ اب متعین یہ کرنا ہے کہ اللہ کا دائرہ حکومت کتنا ہے۔ قرآن اور تمام مذاہب اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ وللہ مافی السمٰوت والارض پوری کائنات اللہ کے حکم کے تحت ہے۔ تو اللہ کی حکومت میں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگ مداخلت کریں اور مداخلت بھی بہت سے معاملات میں۔ اگر انسان اپنے ہر افعال کا خالق بن جائے تو لاکھوں افعال میں غیر اللہ نے مداخلت کی۔

تو اس کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ تخلیق کا تعلق اللہ سے ہے اور باقی کوشش یا قصد مصمم آپ کی طرف سے ہے فرض کر لو ایک عہدے کے مل جانے کا اختیار ایک افسر سے متعلق ہے اس کا معنی یہ کہ جو آدمی اس عہدہ کی خواہش رکھے تو وہ کوشش جاری رکھے مگر عہدہ جب ملے گا جب وہ آفیسر اعلیٰ دستخط کرے گا تو اللہ کی بادشاہی کیا، انسان سے بھی کمزور ہے۔ مگر یقین ہے اللہ کی بادشاہی قوی تر ہے۔ تو فرمایا کہ شر یا نیک کام کی کوشش آپ کی طرف سے ہو اور کام کا ہونا اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ اہلسنت و الجماعت کا مذہب ہے۔ حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ اور اہل حدیث یہ ان تمام کا مسلک ہے۔

منہاج السنتہ النبویہ یہ کتاب چار جلدوں میں لکھی گئی ہے۔ شیعہ اور منکروں کی بات کی تردید میں یہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔

جلد دوم صفحہ 26، 27، 28 پر لکھا ہے کہ خالق اللہ ہے اور قاصد بندہ ہے۔ اور بندہ کو بھی نسبت درست ہے کیونکہ آگے چل کر اسے جزاو سزا کا مالک بننا ہے۔ تو بندہ سبب بن گیا۔ تو قرآن و حدیث میں اسباب و سبب کی طرف نسبت ہے۔ جس طرح ہم کہتے ہیں کہ زمین نے چل دیا وغیرہ۔ ایک حکمت یہ ہوئی کہ اللہ کی عظمت کا یہی تقاضا ہے کہ خالقِ افعال اللہ ہے۔

دوسری حکمت: دوسری حکمت یہ کہ اللہ خالق ہے نہ کہ ہم اس میں ہماری اصلاح ہے کہ فخر و تکبر نہ ہو۔ تا کہ بندہ یہ نہ کہے کہ میں نے یہ پیدا کیا اور میں نے وہ کیا۔ تو جب اللہ تعالےٰ خالق ہوا تو اس پر بندہ کوئی فخر نہیں کر سکتا۔ جو نیکی و بدی کرو اس پر فخر نہ کرو۔ اگر نیکی کی اور اس پر فخر نہ کیا بلکہ عاجزی کی تو یہ محض تمہاری نجات ہے۔ لایدخل احدکم الجنت بعملہ ولا انت یارسول اللہ ولا انا الاان یتغمدنی اللہ برحمتہ۔ بندہ اللہ تعالےٰ کے فضل سے جنت میں جائیگا نہ کہ عمل صالح سے مثلاً ایک آدمی نیک عمل، نماز ادا کرتا ہے۔ تو نماز میں ایک قول ہے جو زبان سے ادا ہوتا ہے۔ اور دوسرا عمل ہے کہ رکوع سجود وغیرہ کرنا۔ تو عمل کی طاقت بدن میں ہے اور قول کی طاقت زبان میں ہے۔ یہ طاقت کس نے عطا کی آخر اللہ تعالےٰ نے عطاء کی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بیٹے کو کہنا چاہا کہ فلاں چیز گھر سے لاؤ مگر

فالج کیوجہ سے نہ کہہ سکا تو میں رو پڑا یااللہ میں تو اپنے آپ کو بڑا خطیب جانتا تھا مگر یہ قوت تو سب تیری طرف سے ہے۔ بندہ تو محض عاجز ہے کہ آج ایک جملہ بھی نہیں بول سکتا۔ ہمارا قصد اور ارادہ کے سوا کچھ نہیں۔ تو باقی ساری چیز اللہ کی ہوئی۔ جب سب چیز اللہ کی ہوئی تو پھر اس کا فضل ہونا ضروری ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہم سے نیکی کا کام لیا ہے۔

توفیق نیکی، توفیق عمل، قبولیتِ عمل یہ اللہ تعالےٰ کے فضل کے ماتحت ہیں۔ حضرت اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ وعظ و تقریر کے بڑے امام تھے۔ دو اڑھائی سو وعظ چھپ گئے ہیں اور لوگ ہدایت پا رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میری تقریر کا عام چرچا ہوا اور شہرت ہوئی۔ تو ایک تھانہ بھون کے قریب گاؤں میں جلسہ ہوا۔ جلسہ گاہ میں جب گیا تو دل میں خیال آیا کہ اشرف علی تو اچھا وعظ کرتا ہے۔ تو سٹیج پر خطبہ وغیرہ پڑھا کچھ تلاوت کی پھر ترجمہ کیا اب آگے کوئی مضمون چلاتا ہوں تو ذہن میں کچھ نہیں آتا پھر پرانے وعظوں کو یاد کیا مگر ذہن میں کوئی مضمون نہ آیا۔ دیکھو یاد دلانے والا اگر یاد نہ دلائے تو یاد کیسے آئے۔ دیکھو وعظ بھی گاؤں میں ہے کسی بڑے شہر میں نہیں۔ پھر صاف کہہ دیا کہ میرے ذہن میں کوئی مضمون نہیں جب کوئی مضمون ذہن میں آیا اور اللہ تعالےٰ نے توفیق دی تو عرض کرونگا۔ اس کے بعد گھر آیا تو میں نے کہا کہ

سب چیز کا مالک اللہ ہے تو کیا چیز ہے۔ بہر حال افعال کا خالق خدا ہے وہاں سے چیز آئی تو آئیگی و گرنہ نہیں۔ وما بکم من نعمۃ فمن اللہ تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے۔ اللہ کی طرف سے ہے تو ایک فائدہ مند چیز یہ کہ عظمتِ خداوندی دوم فخر و تکبر نہ ہو اور تیسری چیز تکمیل عبدیت کہ انسان ہر وقت اپنے آپ کو بندہ اور عاجز سمجھے۔ تو تکمیل عبدیت اس طرح ہو گی کہ پہلے زمانہ میں مالک غلام کو جو اختیار دیتا وہ اس کے علاوہ کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ کا واقعہ لکھا ہے۔ حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ نے کہا کہ ایک آدمی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو یہ فقیری کہاں سے ملی ہے۔ میں نے کہا کہ ایک غلام سے۔ ایک منڈی میں گیا ایک غلام سے پوچھا کیا نام ہے؟ کہا جو کہو گے۔ کیا کرو گے؟ کہا کہ جو کچھ کہو گے۔ کیا کھاؤ گے؟ کہا جو کچھ کھلاؤ گے میں نے کہا اُف یہ تو مصنوعی غلام ہے ہم تو خدا تعالیٰ کے حقیقی غلام ہیں۔ جو مصنوعی غلام کیلئے یہ ہے تو حقیقی غلام کیلئے کیا دستور ہو؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم اللہ کے حقیقی غلام ہیں۔ نوکر نہیں ہیں۔ حقیقی اس لئے کہ بنایا اس نے کھلایا، پلایا اور پالا اس نے۔ نوکر اور غلام میں فرق؟ نوکر کیلئے کام متعین ہوتا ہے مثلاً پٹواری کیلئے ایک خاص کام متعین ہے اب پٹواری کے ذمہ یہ نہیں کہ وہ تحصیلدار کے گھر کا پانی بھرے۔ ڈاکٹر کا کام مریض کا

علاج متعین ہے اس پر اور کوئی دوسرا کام نہیں ڈالا جا سکتا بہرحال کام متعین ہوتا ہے۔ مگر بندہ کا کام متعین نہیں۔ آقا جس کام کیلئے کہے گا وہ کریگا۔ تو پروردگار عالم کی طرف سے جو کام آئے اسے کرے۔ ان کل من فی السمٰوٰت والارض الا اٰتی الرحمٰن عبداً۔

اگر مصنوعی غلام کو آقا حکم کرے کہ جاڑے کے موسم میں برف لے آؤ اور وہ حجتہ بازی کرے کہ جاڑے کے موسم میں برف کیا کرو گے۔ تو وہ کہیگا کہ بندہ کا یہ کام نہیں کہ حجتہ کرے۔ اسی طرح قرآن و حدیث سے جو حکم مل جائے تو حجتہ بازی ختم۔ ع

زبان تازہ کردن باقرار او

مغربی تہذیب نے مسلمانوں میں انسانی قانون کے متعلق کوئی جذبۂ بغاوت تو پیدا نہیں کیا مگر خدائی قانون کے متعلق جذبۂ بغاوت پیدا کیا۔ جب میں بلوچستان تھا تو گورنر کا اسٹنٹ میرے پاس آیا۔ اس نے کہا میرے دل میں کچھ شکوک ہیں۔ وہ یہی تھے کہ فلاں کام کی کیا وجہ ہے قرآن لایسئل عما یفعل وھم یسئلون۔ کیا ڈپٹی کمشنر گورنر سے پوچھے کہ یہ کیوں کیا ہے؟ ہم اللہ تعالےٰ سے پوچھ سکتے ہیں؟ تو اسٹنٹ سے میں نے کہا کہ آپ جب دفتر میں ہوں اور آپکو آفیسر کہے کہ 1907ء کی فلاں مثل لاؤ اور آپ کہیں کہ صاحب پہلے اسکی وجہ بتا دیں۔ کہ خاص اس مثل کو کیوں مانگا۔ تو

مغربی تہذیب نے بغاوت پیدا کی۔ مگر خدائی قانون کے متعلق

جواباً کہا کہ ایسا کروں تو نوکری ختم۔ تو میں نے کہا کہ اگر خدا کے متعلق کھوگے تو بندگی ختم۔ تکمیل عبدیت اس طرح ہوتی ہے۔ جو لوگ جبریہ ہیں وہ پھر اسکی توجیہ کیا کرتے ہیں۔ کہ بندہ بالکل بے دخل ہے۔ وہ مثال پیش کرتے ہیں کہ بندہ اللہ کی ملکیت ہے وہ کسی میں کفر اور کسی میں ایمان پیدا کرتا ہے۔ کسی میں نیکی اور کسی میں بدی پیدا کرتا ہے۔ اس میں اللہ پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تو جبریہ آگے مثال دیتے ہیں کہ ایک زمین آدمی کی ملکیت ہے اس نے اس پر ایک حصہ میں مسجد اور ایک حصہ میں پاخانہ تعمیر کیا۔ کیا اس کو کوئی اس تعمیر سے روک سکتا ہے۔ سب انسان ملکیت خدا ہیں۔ کسی کو مؤمن، مسجد کی طرح بنا دیا اور کسی کو کافر، پاخانہ کی طرح بنا دیا۔ باقی جزاو سزا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ جب ایک جگہ کو پاخانہ بنا دیا تو بدبو لازمی چیز ہے۔

مسئلہ تقدیر:

اختصار سے کہ تقدیر میں دو چیزیں ہیں۔ قضاء وقدر۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے۔ کہ پوری کائنات اول سے آخر تک اور کائنات کے تمام واقعات کائنات کی پیدائش سے قبل جو اللہ نے اپنے علم ازلی میں طے کئے ہیں۔ وہ تمام کے تمام کائنات کی تقدیر ہیں۔ اور وہ مقدرات جب وجود میں آجائیں تو یہ قضاء

ہیں۔ تو حقیقت میں قضاء تقدیر کی شرح ہے۔ ایک مثال پیش کرتا ہوں ایک ماہر انجینئر کو محکمہ بلاتا ہے کہ فلاں جگہ چھاؤنی کیلئے نقشہ بناؤ۔ تو وہ پہلے دماغ میں نقشہ بناتا ہے پھر کاغذ پر، پھر مستری کے ذریعہ عمل میں لاتا ہے۔ تو دماغی نقشہ انسانی تقدیر ہے۔ تو پھر کاغذ کے بعد جب وجود میں آیا تو یہ قضاء ہے۔ اور تقدیر پر معتزلہ اور شیعہ کے علاوہ تمام گروہ متفق ہیں۔ خلق کل شیٍٔ فقدرہ تقدیراً۔ امام راغب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ تقدیر مقدار سے نکلا ہوا ہے۔ کہ اللہ تعالٰی نے صحیح مقدار پر تخلیق دی۔ مثلاً ہم گھر سے درس پر آئے تو اللہ نے قدموں کی تعداد بھی لکھی۔ اور پھر کونسا قدم زمین کے کونسے حصے پر آیا ہے۔ بہر حال تقدیر ایک صحیح اندازہ پر تخلیق ہے۔ حضرت جابرؓ لایؤمن احدکم حتی یؤمن بالقدر خیرہ وشرہ۔ جب تک خیر وشر کی تقدیر کا قائل نہ ہو تو مومن نہیں۔ وانما ما اصابک لم یکن لیخطاء۔ کہ تم کو جو واقعہ پیش آیا وہ ٹلنے والا نہ تھا اس پر ایمان رکھو وانما ما اخطاک اور جو تم سے ٹلا ہے وہ تمہیں پہنچنے والا نہ تھا۔ اس پر ایمان رکھو۔ مطلب یہ ہے۔ کہ تقدیر کے موافق انسان کو نفع و ضرر پہنچتا ہے۔ جب معاملہ تقدیر کا ہوا تو بڑا شبہ یہ کہ اگر تقدیر ہے تو تدبیر کیا؟ تقدیر پر اصل بحث انشاء اللہ العزیز دوسرے درس میں ذکر کرونگا۔ آدمی یہی سمجھتا ہے کہ جب تقدیر ہے تو تدبیر کی کیا ضرورت ہے۔ یہ احمقانہ سوالات مسئلہ تقدیر نہ جاننے کیوجہ سے پیدا

ہوتے ہیں۔ حالانکہ تدبیر تقدیر کا ایک جز ہے۔ خدا تعالیٰ صحابہ کرامؓ پر رحمتیں نازل کرے۔ انہوں نے یہ سوال کیا۔ ارائیت یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دواءً تتداوی اس دواء کی خبر دیں جس کے ذریعہ ہم علاج کرتے ہیں۔ اور درکاً اور ایک (دم) جس کے ذریعہ ہم بیمار کو دم کرواتے ہیں۔ اور ڈھال جسے ہم جنگ میں استعمال کرتے ہیں۔ کیا یہ تینوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو ٹال سکتے ہیں؟ جواب دیا ھی من قدر اللہ یہ بھی اللہ کی تقدیر میں داخل ہیں۔ تو تقدیر اور تدبیر کا تصادم ختم ہو گیا۔ کل اور جز میں تصادم نہیں ہوتا۔ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تدابیر سب کی سب تقدیر کے پیٹ میں پڑے ہیں۔ مثلاً آپ کا بیٹا بیمار ہوا ڈاکٹر نیاز صاحب سے علاج کرایا تو درست ہو گیا۔ دوسرے کا بیٹا بیمار ہوا تو وہ قاری نورالحق صاحب کے دم سے درست ہوا۔ تو یہ دونوں تقدیر میں اسی طرح تھے۔

درس نمبر ۸
25 ستمبر 1966ء

اقسامِ تقدیر[۱]

اس سے پہلے درس میں تقدیر کے مسئلہ پر قضاء وقدر کا بیان ہوا۔ اور سب کو معلوم ہے کہ تقدیر کا مسئلہ ایمان میں داخل ہے۔ آج کل عمل تو بگڑا ہے لیکن کوشش یہ ہو کہ عقیدہ نہ بگڑے۔ عقیدہ میں یہ ضروری ہے کہ ایمان کی بنیادی چیزوں پر پختہ یقین ہو۔ اس میں تقدیر بھی شامل ہے۔ مثلاً بچوں کو اٰمنتُ باللہ وملائکتہ و کتبہ ورسلہ سکھایا جائے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے۔ لایؤمن احدکم حتی یؤمن بالقدر وخیرہ وشرہ کہ جب تک خیر وشر کی تقدیر پر ایمان نہ ہو تو مومن نہیں بن سکتا۔ اللہ تعالےٰ اگر تقدیر کا مسئلہ ہمارے ایمان میں نہ رکھتا تو اس کو کوئی نقصان نہ تھا۔ بلکہ اس کا ہونا ہمارا فائدہ ہے۔ آگے چل کر بیان کرونگا۔

تفصیلِ تقدیر: آج کل کوئی شخص دین سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ دیگر مسائل تو واضح اور کھلے ہیں۔ مگر یہ مسئلہ پیچیدہ ہے۔ مگر جہاں تک ہو سکے اسے سمجھنا چاہیے۔ تقدیر کا معنی یہ کہ

انسانی علم اور خدائی علم میں فرق؟ انسان کا علم اس وقت ہے جب وہ چیز موجود ہو۔ مثلاً جب آدمی کا بیٹا پیدا ہو جائے تو اسے پتہ چلتا ہے۔ یا مرض آنیوالا ہے تو اس کا اسے پتہ نہیں۔ جب مرض پڑیگی تو اسے پتہ چلیگا کہ مرض آ گئی ہے۔ تو انسانی علم کی شان یہ کہ چیز معلوم ہو تو علم ہو ورنہ نہیں۔ لیکن اللہ تعالےٰ کی ذات کا علم موجود کے ساتھ خاص نہیں۔ مثلاً ہمیں اتوار کے درس کا علم آج ہوا۔ لیکن آدم علیہ السلام کی پیدائش سے کئی اربوں سال پہلے اللہ تعالےٰ کو ایسے معلوم تھا جس طرح آج معلوم ہے۔ اللہ تعالےٰ کو ماضی، حال، مستقبل سب چیزوں کا نام برابر ہے۔ اس کو علم ازلی، ذاتی اور قدیم کہا جاتا ہے۔ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کی عطا کے بعد جب تبلیغ شروع کی تو حضرت صدیق اکبرؓ ایمان لائے۔ اور ابوجہل ایمان نہ لایا لیکن اربوں سال قبل اللہ تعالےٰ کو معلوم تھا کہ ابوجہل ایمان نہ لائیگا۔ اب جب یہ بات ہوئی تو کائنات کے شروع سے آخر تک پورے واقعات جو کسی چیز سے واقع ہونیوالے تھے یہ کائنات سے کئی سال قبل اللہ کے علم میں تھے۔ چاہے آسمان میں یا زمین میں واقع ہونیوالے تھے۔ اس خدائی علم کا نام تقدیر ہے۔ اس میں شرح عقائد کی شرح اور فتوحاتِ مکیہ میں تقدیر کو علم کے تحت داخل کیا ہے۔ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ نے تقدیر کو صفتِ ارادہ کے تحت داخل کیا ہے۔ ابوجہل کافر بنا

اور ابوبکر صدیقؓ مسلمان بنا یہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ کو یہ معلوم تھا کہ فلاں وقت یہ دونوں حضرات اپنے ارادہ سے۔ صدیقؓ ایمان اپنے ارادہ سے اور ابوجہل کفر اپنے ارادہ سے حاصل کریگا۔ تو تخلیق عالم سے قبل اللہ کے علم اور ارادہ دونوں میں یہ بات تھی۔ اب یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ تدبیر اور تقدیر دونوں کو آپس میں ٹکر نہیں۔ اور تکلیف کو تقدیر سے ٹکر نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ازل میں جان لیا ہے کہ یہ شخص اس طرح کرے گا۔ اللہ نے مومن کا ایمان اور کافر کے کفر اور کل واقعات حوادث کو تقدیر میں مقدر کیا۔ علم وہ ہے جو معلوم کے مطابق ہو۔ اور ارادہ وہ ہوتا ہے جو علم کے مطابق ہو۔ تقدیر کا یہ معنی نہیں کہ قلم نے پہلے جو کچھ لکھا ہے وہ ہم نے کرنا ہے۔ نہیں ہم نے اپنے ارادہ سے جو کرنا ہے وہ قلم نے پہلے لکھ رکھا ہے۔ صدیق اکبرؓ نے اپنے ارادہ سے ایمان لانا تھا اللہ تعالےٰ کی تقدیر نے اس کو لکھا۔ اور ابوجہل نے کفر اپنے ارادہ سے لانا تھا اللہ کی تقدیر نے اسے کافر لکھا۔ جیسی چیز ہو ویسا علم ہونا ضروری ہے۔ علم معلوم کا آئینہ ہے۔ آئینہ میں سیاہ آدمی سیاہ نظر آئیگا۔ اگر ایسا نظر نہ آئے تو وہ آئینہ آئینہ نہیں۔ تو اللہ تعالےٰ کی تقدیر کو آئینہ سمجھو۔ آئینہ صدیق اکبرؓ کے سامنے ہوا تو ایمان تھا۔ ابوجہل کے سامنے ہوا تو کافر تھا۔ تو جتنے حوادثات ہونیوالے تھے اسی طرح آئینہ میں نقش ہو گئے۔ آپ نے بہاولپور

جانے کا ارادہ کیا تو بہاولپور جائیں گے نہ کہ سمہ سٹہ۔ ارادہ کی کارروائی علم کے گردا گرد چلتی ہے۔ اب یہ کتنی نادانی ہے کہ کوئی یہ سمجھے کہ تقدیر مجبور کرنیوالی ہے۔ ایک مثال کہ فرض کر لو کہ قیامت کے دن ابوجہل کے متعلق فیصلہ ہو جائے کہ اسے دوزخ میں ڈال دو۔ فرض کر لو ابوجہل پوچھے کہ کیوں ڈالتے ہو جواب ملے کہ کفر کے جرم کی وجہ سے۔ اس کے جواب میں ابوجہل کہے میں تو کافر نہیں تھا آپنے کفر میری تقدیر میں لکھا تھا۔ تو اللہ نے جواب دیا کہ میں نے تقدیر میں تیرا کفر نہیں لکھا مگر اسم علیم کے تحت کہ تو اپنے اختیار سے کفر کرنیوالا ہے۔ اگر تیرا جرم نہ ہوتا تو جہنم مین نہ ڈالا جاتا۔ تو تقدیر اور علم کا ایسا معاملہ ہوا۔ مثلاً ایک آدمی کے سامنے بڑا آئینہ ہے وہ کسی منصب پر ہے تو کوئی آدمی اپنے کام کیلئے آتا ہے اور وہ کام کے عوض رشوت مانگتا ہے۔ تو وہ سو روپیہ دیتا ہے۔ تو لین دین میں نقشہ آئینہ میں آجاتا ہے تو تقدیر میں اتنا فرق ہے کہ آئینہ میں وہ چیز ہوتی ہے جو اس وقت ہو۔ اور تقدیر اربوں سال پہلے بھی نقش کر لیتی ہے۔ اور آئینہ سے وہ واقعہ جو ہٹ جاتا ہے تو نقش بھی ہٹ جاتا ہے۔ لیکن اللہ کی تقدیر میں وہ واقعہ نقش رہ جاتا ہے۔ تو اگر وہ پکڑے جائیں تو کیا یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ قصور آئینہ کا ہے۔ تو آفیسر کہے گا کہ تو نے قصداً کیا ہے اگر نہ کرتا تو آئینہ میں منقش کیسے ہوتا۔ ع

ذرہ ذرہ دہر کا زندانی تقدیر ہے
پر وہ مجبور و بیچار تدبیر ہے
(اقبال)

تقدیر کا آسان معنی اللہ تعالےٰ کا علمی پروگرام۔ آج کل آفیسر دورے پر جاتا ہے تو پروگرام پہلے بنا لیتے ہیں۔ تو جس طرح پروگرام بناتے تھے ویسے ہی جاتا ہے۔ نہ کہ جس طرح پروگرام کھے۔ پروگرام تو خود بنایا ہے۔ امام غزالی رحمتہ اللہ کا بیان ہے کہ اچھی تقدیر، اچھی تدبیر کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً آپ مالدار بننا چاہیں تو مالداری کیلئے جو معقول سے معقول تدبیر ہے وہ آ جائیگی۔ اپنے لئے تقدیر معلوم کرنا آسان ہے۔ مثلاً جمعہ کے دن آپکے دل میں یہ خیال آ جائے کہ کیا تقدیر میں نماز جمعہ لکھی ہے یا نہیں۔ بس ٹانگوں کو حرکت دو نماز پڑھو تو یہ تقدیر ہے۔ تو کائنات میں حرکت کرنا تقدیر ہے۔ مطلب یہ کہ انسان کا قصد اور ارادہ تقدیر ساز ہے۔ آسمان و شمس و قمر مجبور ہیں۔ بہرحال یہ انسان اور جن کی تقدیر ہے۔ یعنی اسے تقدیر اختیاری کہتے ہیں۔ اور ایک ہے تقدیر جبری جس کا اللہ نے اپنے خلیفہ انسان کو کچھ اختیار دیا ہے کیونکہ خدا کا جانشین ہے۔ کہ انسان اور جن کے علاوہ تقدیر جبری ہے۔ اللہ کا ارادہ بارش کا ہوگا تو برسے گی ورنہ نہیں

وغیرہ۔ اب ایک تقدیر کے سلسلہ میں ثلاثی نظام پیش کرتا ہوں۔

اللہ تعالےٰ کی تخلیق میں دو قسم ہیں۔ انسان اور غیر انسان۔ جن انسان میں شامل ہیں۔ انسان و جن کے علاوہ عالم بالا و زیریں میں تقدیر جبری چل رہی ہے۔ انسان کی زندگی کے دو حصے ہیں۔ (1) جبری تقدیر۔ (2) اختیاری تقدیر۔

جبری تقدیر یہ ہے کہ انسان بڑھتا ہے جوان، بوڑھا وغیرہ ہوتا ہے۔ تو اپنا اختیار نہیں۔ یہ انسان کی زندگی کا جبری تقدیر کا حصہ ہے۔ تو اللہ تعالےٰ نے ادھر بھی اپنی گرفت رکھی ہے تاکہ انسان باغی ہو کر خدائی کا دعویٰ نہ کرے۔ یورپ نے جتنی ترقی کی ہے وہ حیوانی ترقی ہے۔ نہ کہ انسانی ترقی۔ ایک آدمی نے کہا کہ یورپ تو بہت اونچا ہو گیا۔ میں نے کہا اس کو چھوڑو دیکھو یورپ دور کیوں جاتا ہے۔ ہمیں صرف اتنا کر دے کہ دانت نہ اکھڑیں، بڑھاپا نہ آئے، بال سفید نہ ہوں۔ یہ جبری تقدیر ہے۔ یہاں یورپ کا باپ بھی عمل نہیں کر سکتا۔ باقی اڑنا تو اختیاری تقدیر ہے۔ پرندے بھی اڑتے ہیں وغیرہ۔ اب بات تو سمجھ آ گئی کہ کائنات پر ہم نے تقدیر کو منطبق کیا کہ پوری کائنات میں انسان کا ایک حصہ اختیاری تقدیر کے ساتھ ہے اور دوسرا حصہ جبری تقدیر کے تحت ہے۔ تقدیر کے بہت حصے ہیں (1) تقدیر علمی کئی بار انسان کی تقدیر کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ (2) تقدیر لوحی (3) تقدیر

پیثاقی انسان سے جو معاہدہ لیا گیا ہے۔ (4) تقدیر رحمی کہ رحم مادر کے اندر تقدیر (5) تقدیر سنوی کہ سالانہ تقدیر (6) تقدیر یومی روز مرہ کی تقدیر۔ کتاب وسنتہ سے ان چھ تقدیروں کا علم ہو جاتا ہے۔ ان میں پہلی تقدیر علمی کہ پوری کائنات کے حوادث تخلیق کائنات سے پہلے ان کے پورے نقشے اللہ تعالیٰ کے علم میں تھے۔ یہ علمی نقشے کائنات کی تقدیر تھی۔ حضرت خواجہ عبدالقدوس گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے زمانہ میں ایک شخص آیا عرض کی کہ مجھے چند مسائل میں شک ہے۔ (1) کہ آپ کہتے ہیں کہ شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اگر شیطان آگ میں پڑ جائے تو اسے کیا دکھ ہو گا۔ (2) کہ خدا ہر جگہ ہے کہیں تو بتلادو۔ (3) جب ہم تقدیر کے قائل ہیں تو تدبیر نہیں کرنی چاہیے۔ تو خواجہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا اس کا دماغ خراب ہے سمجھانا دشوار ہے۔ تو ایک مٹی کا ڈھیلہ قریب پڑا تھا اسے مارا بزرگ کی ضرب تھی چیختا چلایا بھاگا۔ آپ نے بلایا پوچھا کیا بات ہے؟ کہنے لگا تھانے جارہا ہوں آپ نے فرمایا میں نے تو جواب دیا ہے۔ کہ تم کس سے پیدا ہوئے؟ کہا کہ مٹی سے۔ تو آپ نے فرمایا میں نے بھی تو مٹی ماری ہے۔ کہا کہ حضرت سمجھ گیا۔ کہا کہ درد ہے کہاں! کہا کہ ہر جگہ، کہا دکھاؤ گے؟ کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا اسی طرح خدا ہر جگہ ہے دیکھا نہیں جا سکتا۔ فرمایا کہ تھانہ کیوں جا رہے تھے؟ کہنے لگا مقدمہ کرتا۔ تو آپ نے فرمایا کہ تم نے اعتراض کیا کہ تدبیر کی

ضرورت نہیں مگر آپ نے تھانہ جانے کی تدبیر کیوں کی۔ معلوم ہو گیا کہ یہ انسان کی فطرت میں ہے۔ اگر کسی کے گھر میں آگ لگ جائے تو فوراً بجھائے گا۔ لیکن جہاں نماز وغیرہ کا کام آجائے تو کہتے ہو تقدیر میں نہیں۔ قرآن، ولو شاء اللہ لجمعھم علی الھدی کہ یہ کافرانہ عمل ہے۔ حضرت مولانا رومی رحمتہ اللہ نے مثنوی میں فرمایا ہے یہ جو کہتے ہیں کہ انسان حد کے اندر مختار ہے۔ وہ حضرت علیؓ کا مقولہ ہے کسی نے آپؓ سے پوچھا کہ انسان مختار ہے؟ آپ نے فرمایا نصف۔ اس آدمی کو فرمایا ایک پاؤں اٹھاؤ۔ اس نے اٹھالیا پھر فرمایا یہ اٹھا رہے اور دوسرا بھی اٹھاؤ۔ اس نے کہا یہ نہیں کر سکتا۔ تو آپ نے فرمایا بس اتنا اختیار ہے۔ انسان ایک دائرہ کے اندر محتاج ہے اور ایک خاص دائرہ کے اندر مجبور ہے۔ یہ سب کا متفقہ فیصلہ ہے۔ تو اہل اسلام کی بات بین بین رہی۔ معتزلہ انسان کو کلیتہً مجبور کیا۔ مگر اہلسنت و الجماعت نے کہا ہے کہ قصد اور ارادہ کرنا انسان کا کام ہے۔ اور کام کرنا اللہ تعالٰی کا کام ہے۔ مولانا جلال الدین رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں

خجلت ماشد دلیل اختیار
زاری ماشد دلیل اضطرار

ہماری شرمندگی ہمارے مختار ہونیکی دلیل ہے۔ ایک آدمی زنا میں مشغول ہو عین اسی وقت کوئی آجائے تو اس کا چہرہ زرد ہو جائیگا۔ یہ

ہے خجلت یعنی شرمندگی۔ چہرہ اس وقت زرد ہوتا ہے جب روح شرمسار ہو۔ تو کہتے ہیں اگر انسان مجبور ہوتا تو چہرہ پر زردی کیوں آتی۔ کیونکہ جو جبری کام ہے وہ جرم تو نہیں۔ مثلاً ایک جج نے قاتل کو سزائے موت لکھی اس کے بعد اگر معلوم ہو جائے کہ یہ بریٔ الذمہ تھا تو کیا قلم شرمسار ہو گی یا جج صاحب؟ یقیناً جج متأثر ہو گا۔ کیونکہ جج بااختیار اور قلم بے اختیار ہے۔ ع

انبیاء در کار دنیا جبر اند
کافر در کار عقبیٰ جبر اند

کافر عقبیٰ کے کام میں جبری ہیں اور انبیاء علیہ السلام دنیا کے کاروبار میں جبری ہیں یعنی نبی علیہم السلام دنیا کے کاموں میں ڈھیلے ڈھالے ہیں۔ اور کافر عقبیٰ کے کاموں میں ڈھیلے ڈھالے ہوتے ہیں۔

درس نمبر۹
30 ستمبر 1966ء

اَقسامِ تقدیر۔۲

پہلے درس میں تقدیر کی اقسام کا مختصر بیان ہوا تھا۔ انسان کی تقدیر کا فیصلہ مختلف جگہوں میں ہوا ہے۔ جو قرآن و حدیث کی رو سے

ایک قسم تقدیر علمی ہے۔

وہ یہ ہے کہ جب صرف اللہ تعالےٰ تھا۔ کائنات نہ تھی۔ آخر وقت تک کائنات میں جو کچھ ہونا تھا۔ ایمان کفر، طاعت، معصیت، خیروشر وغیرہ سب اللہ تعالےٰ کے علم میں تھے۔ یہ کائنات کی علمی تقدیر ہے۔ اس کی طرف قرآن کا اشارہ ہے وَاللہُ بکل شیٍ علیم کہ اللہ تعالے ہر شئی کا علم رکھتا ہے۔ واحاط بکل شیٍ علما کہ اللہ تعالے کا علم ہر شئی پر محیط ہے۔
واحصی کل شیٍ عددا کہ ہر چیز کی گنتی کا علم اللہ کے پاس ہے۔ خاک کا ایک ایک ذرہ اور ریت کے اعداد شروع سے آخر تک اس کے گنتی میں ہے۔ یہ کائنات کی علمی تقدیر ہے۔

تقدیر لوحی

کائنات کا ایک صدر دفتر ہے کہ بعض معلوماتِ الٰہیہ اس دفتر میں تحریر میں آجاتے ہیں۔ اسلام کی اصطلاح میں اسے لوح محفوظ کہتے ہیں۔ تو جو اللہ کی شان کے مطابق ہیں ویسی ہی تحریر ہو گی۔ گویا قلمِ تقدیر نے ان معلوماتِ الٰہیہ کو لوح محفوظ میں لکھا۔ حدیث۔ کتب اللہ مقادیر الخلائق اللہ تعالےٰ نے پوری مخلوقات کے کارناموں کے اندازوں کو لوح محفوظ میں لکھوایا۔ قبل ان یخلق السمٰوٰت والارض بخمسین الف سنۃ۔ زمین و آسمان کی پیدائش سے پانچ ہزار سال پہلے تحریر کی گئی۔ یہ وہ لوحی تقدیر ہے جو پوری کائنات کی تقدیر ہے انسان کی قسمت کا فیصلہ ہے۔

(3) تقدیر میثاقی:

یہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بعد پیدا ہوئی۔ پہلی دو تقدیریں، تقدیر عمومی ہیں اور باقی سب تقدیریں انسانی تقدیریں ہیں۔ خاص تقدیریں ہیں۔ الست بربکم قالوا بلی آدم علیہ السلام کی پشت مبارک کو قدرت نے چھوا تو باریک ذرات کی شکل میں نورانی صورتیں نکلیں۔ دوبارہ چھوا تو غیر نورانی ذرات نکلے یہ فرما کر پھر فرمایا یا الست بربکم۔ یعنی عہد لیا گیا۔ پھر فرمایا گیا کہ نورانی شکل کے ذرات جنت والے ہیں اور تاریک شکل والے

ذرات جہنمی ہیں۔ جو دنیا میں جا کر اپنے ارادہ سے جہنم کمائیں گے۔ اعتراض کہ اس وقت میثاق لینے کا کیا موقعہ تھا۔ اس وقت کا تو عہدوپیمان یاد ہی نہیں رہتا۔

جواب کہ یاد دہانی بھی کرائی گئی کہ ایک لاکھ 24 ہزار یا کم و بیش نبی بھیج کر عہد یاد دلایا ہے۔ دوسرا اشکال یہ کہ اس عہد کا اثر انسانی زندگی پر پڑا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ پڑا ہے۔ کہ انسانی اکثریت کا اللہ تعالےٰ کی ربوبیت پر جو اتفاق ہے۔ یہ اس عہد کا اثر ہے۔

(4) تقدیر رحمی:

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان خلق احدکم تجمع فی رحم امہ اربعون نطفۃً۔ پھر چالیس دن بعد خون بنتا ہے ثم تکون مضغۃً کذالک پھر گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے۔ فیبعث اللہ الیہ ملکاً تو پھر ایک فرشتہ بھیج دیتا ہے۔ فرشتہ پوچھتا ہے اَذکر او انثٰی کہ یہ مذکر بنائیں یا مؤنث۔ یھب لمن یشاء اناثا ویھب لمن یشاء ذکورا کسی کو دونوں عطا کرتا ہے اور کسی کو بانجھ بنا دیتا ہے۔ یہ خدا تعالےٰ صرف اس لئے کیا کہ لڑکی لڑکا میرے ہاتھ میں ہے۔ ہم اولاد کیلئے بھی اللہ تعالےٰ کا دروازہ چھوڑ دیتے ہیں۔ معاذاللہ یا تو یہ کہو کہ اللہ تعالےٰ جھوٹا ہے اور پیر سچا ہے۔ ہمارے علاقہ میں ایک پیر آیا شہرت ہو گئی کہ لڑکا دیتا ہے۔ ایک کو تعویذ

دیا اسکی لڑکی ہوئی کہا تعویذ لاؤ دیکھا تو لکھا ہوا تھا لڑکا نہ لڑکی۔ کہ میں نے لکھا تھا لڑکا نہ، لڑکی ہو۔ دوسرے کو دیا تو لڑکا پیدا ہوا کہا کہ تعویذ پر لکھا تھا لڑکا، نہ لڑکی۔ تیسری کو کہا کہ تمہاری اولاد نہیں ہوتی تو اس کے تعویذ پر لکھا تھا نہ لڑکا نہ لڑکی۔ تو وہاں سے جو آرڈر ملے وشقی سعید۔ کہ قسمت کیا بناؤں یعنی مؤمن یا کافر لکھوں۔ فماالرزق وماالاجل عمر اور رزق کتنا لکھوں۔ انسان آج کل تو خدائی ہدایات سے پوری طرح محروم ہو گیا ہے۔ روزی کا فیصلہ تو پہلے ہو چکا ہے۔ تقدیر رحمی کے ماتحت مخفی تحریر کے ذریعے۔ یا پیشانی یا جسم کے کسی دوسرے حصے پر (تقدیر غیبی ہے) لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ تقدیر غیبی ہے اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ انسان کا مال وہ ہے جو کھا لے نہ کہ وہ جو بینک میں جمع ہے یہ بات حدیث شریف سے ثابت ہے۔ تو یہ تقدیر رحمی ہے یہ چار ہو گئے۔

(5) تقدیر سنوی:

سالانہ تقدیر اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں اشارہ کیا ہے انا انزلنا فی لیلۃ مبارکۃ ہم نے قرآن کو برکت والی تاریخ میں اتارا ہے۔ وہ ہے لیلۃ القدر۔ جس رات میں انسان کی سالانہ قسمت کے فیصلے طے ہونگے اور فرشتوں کو سال کا بجٹ حوالہ کیا جاتا ہے۔ کہ فلاں کا رزق، عمر وغیرہ اتنا ہے۔ مرض اتنی، فتنے اتنے، نیکیاں اتنی وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات میں سالانہ جو کچھ ہو گا وہ

لیلۃ القدر کی شب کو فرشتوں کو بتلا دیا جاتا ہے۔ اور شب قدر رمضان کے آخری حصہ میں ہے۔

(6) تقدیر یومی:

کہ روزمرہ کی تقدیر۔ دیکھو کتنے انسانوں کی یومیہ تقدیر۔ قرآن نے اس کو ذکر کیا ہے کل یوم ھوفی شأن۔ کہ روزانہ فیصلوں میں خدا حکم دے رہا ہے۔ جس دن سے امریکہ نے اسرائیل کو عرب پر اکسایا ہے۔ تو مغضوب قوم سے تعاون کیا تھا۔ تو ہم نے کہہ دیا تھا کہ اب اس کے زوال کا زمانہ آ گیا ہے۔ آج پوری دنیا میں ذلیل ہے۔ حقیقت تو اللہ تعالےٰ جانتا ہے مگر کتاب و سنت کے ذریعہ ہم نے جو بتایا ہے تھوڑا بہت اس کا علم اللہ کو ہے مکمل۔ اللہ نے انسان کو اختیار دیا ہے کہ کفر اختیار کرے یا ایمان اختیار کرے۔

جس آئینہ کی مثال دی تھی کہ آئینہ کا چیز کو نقش کرنا۔ آئینہ کا ظلم نہیں۔ تیرا فعلِ بد کا کرنا ظلم ہے۔ یہ میری تشریح ناکافی ہے اس وقت تک جب تک حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریح ساتھ نہ ہو۔ امام رازی رحمۃ اللہ نے تفسیر کبیر میں ایک حدیث ذکر کی ہے۔ عن ابن عمرؓ ان رجلاً فقال یا ابا عبد الرحمن یعنی مراد ابن عمرؓ ہیں۔ انا اقواماً یزنون ویسرقون ویقتلون النفس التی حرم اللہ بالحق۔ اور پھر کہتے ہیں کہ یہ چار گناہ علم تقدیر

میں طے شدہ تھے تو ہم اس سے بریٔ الذمہ ہیں۔ فرماتے ہیں کان ذالک فی علم اللہ فلم نجدہ بداً۔ یہ ایک شخص نے سوال کیا فغضب تو حضرت ابن عمرؓ کو سخت غصہ آیا ثم قال سبحان اللہ العظیم۔ اللہ تعالیٰ جو کہ بڑا ہے۔ وہ ہر نقص سے پاک ہے۔ قد کان فی علمہ ازیفعلوا فلم علیہم اللہ علی فعلھا۔ اللہ کو علم تو تھا مگر اللہ کے علم نے کرنے پر مجبور نہیں کیا۔

حدثنی ابنؓ عمرؓ بن الخطاب انہ سمع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقول مثل علم اللہ کمثل السماء والارض التی الخ۔ چھ قسم کے تقدیر علم ہو گئے اور علم معلوم کو گھیرتا ہے۔ یعنی جس طرح آسمان زمین نے گھیرے میں لیا ہے۔ اسی طرح چھ قسم کی تقدیریں اس کائنات پر محیط ہیں۔ یعنی کائنات میں جو کچھ ہے یہ چھ تقدیریں اس پر چھائی ہوئی ہیں۔ اور جس طرح آسمان و زمین تم سے مجبوراً کچھ نہیں کرواتے۔ اس طرح اللہ کی تقدیر بھی تم کو مجبور نہیں کرتی۔ اب دو چیزوں کا فیصلہ باقی ہے۔ (۱) فوائد تقدیر: مسلمان کیلئے اللہ تعالیٰ نے جو عقیدے رکھے ہیں ان کا فائدہ انسان کو ہے نہ کہ اللہ کو۔ تقدیر کے اندر فائدے ہیں۔ ہم اس وقت تک مؤمن نہیں بن سکتے جب تک یہ ایمان نہ ہو کہ جو کچھ ہے یہ اللہ کی تقدیر میں ہے۔ دو فائدے قرآن نے گنے ہیں۔ ما اصابکم من مصیبۃ فی الارض الخ اگر تمہیں کوئی مصیبت زمین یا تمہاری جانوں میں پہنچتی

ہے۔ مگر یہ علم الٰہی کے علاوہ ہم نے لوح محفوظ میں لکھ دی ہے بہت پہلے۔ ہم نے یہ معاملات پہلے کیوں لکھے تا کہ تمہیں کسی مصیبت پر غم نہ ہو لکیلا تاسوا علی مافاتکم ولا تفرحوا بما اٰتکم۔ اور اس نعمت پر مغرور نہ ہو جو ہماری طرف سے ملے۔ وذالک علی اللہ یسیر اور یہ پہلے سے لکھنا اللہ کیلئے آسان ہے۔ اب اس آیت کی شرح یہ کہ دنیا میں ہر آدمی کا فطری جذبہ ہے کہ غم نہ ہو اور خوشی ہو۔ عقیدۂ تقدیر انسان کے دل سے ہر غم کو مٹا دیتا ہے بشرطیکہ پختہ یقین ہو۔ غم آخر انسان کرتا ہی ہے۔ اور غم اس لئے نہ ہو گا کہ آپ سمجھیں گے کہ یہ سب کچھ تقدیر کی وجہ سے ہوا ہے۔ اور اگر پورا عالم میرا مددگار ہوتا تو یہ تقدیر ٹلنے والی نہ تھی۔ تو غم تو پھر بیوقوفی ہے۔ انما اصابک لم یکن لیخطئک۔ مصیبت ٹلنے والی نہ تھی۔ یہ سب مؤمن کیلئے ہیں نہ کہ کافر کیلئے جب فیصلۂ تقدیر پر یقین ہو جائے کہ یہ فیصلہ اللہ رحیم اور مالک اور حکیم کا فیصلہ ہے۔ حضرت خواجہ عزیز حسن رحمتہ اللہ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ کے خلیفہ تھے ان کا لڑکا سخت بیمار ہو گیا۔ گریجویٹ تھا دعا کیلئے حضرت تھانوی رحمتہ اللہ کو خط لکھا آپ نے جواباً فرمایا کہ اگر بیٹا فوت بھی ہو جائے تو یہ اللہ رحیم، مالک اور حکیم کا فیصلہ ہے۔ (یہ واقعہ پہلے گذر چکا ہے اس لئے مختصر تحریر کیا ہے) لکیلا تاسوا علی مافاتکم۔ کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے نکلا ہے یہ تقدیر میں تھا۔ دیکھو ایک شخص نے تجارت کی اور

نقصان اٹھایا اور دوسرے نے نفع کمیا تو غرور نہ کرے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ تم کون ہو کام تو میں کرنیوالا ہوں تمہارا تو صرف ارادہ کرنا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کہے کہ میاں یہ مربع ہے تو وہ صرف ارادہ کرلے کاشت میں کروں گا اور کٹائی تو کرنا۔

درس نمبر۱
12 اکتوبر 1966ء

عقیدۂ تقدیر کے فوائد

ہمارے ایمان کی تکمیل کیلئے ایک ضروری جز اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ایمان رکھنا ہے۔ گذشتہ درس میں اس کے دو فائدے بیان ہوئے۔ آج تیسرا فائدہ بیان ہو رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان کے اندر خالق کا خوف رہے۔ اور تمام اخلاقِ رذیلہ کی جڑ خوف مخلوق ہے۔ اخلاق رذیلہ میں سے مثلاً ایک پست خلق کینہ و بغض رکھنا ہے وغیرہ۔ اس سے باہمی اتفاق پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ کینہ اس لئے رکھتا ہے کہ فلاں شخص کسی وقت مجھے کوئی نقصان پہنچائے گا۔ (2) بری عادت نفاق اور مکروفریب ہے یہ اس لئے کرتا ہے کہ ڈر کے مارے کھل کر بات نہیں کرتا۔ گویا وہ شخص دل میں قابل تعریف نہیں اور زبان پر اس کی تعریف کر رہا ہے۔ منافقت کا پودا خوف مخلوق سے اگتا ہے۔ اگر مخلوق کا ڈر نہ ہو تو تختہ دار پر بھی سچ کہے گا۔ اس میں مسلمان دوسری قوموں سے بہت زیادہ تعداد میں مبتلا ہے۔ (3) بہت بری عادت جھوٹ بولنا ہے۔ جھوٹ

کا سرچشمہ بھی مخلوق کا خوف ہے۔ کہ اگر ایک آدمی کو سچ بات کہیں تو ناراض ہو جائیگا چاہے اللہ تعالےٰ ناراض بھی ہو۔ خالق کی ناراضگی نظر انداز کی گئی۔ اور مخلوق کی ناراضگی کو جھوٹ کے ذریعے رد کیا گیا۔ جو تمہارے سامنے منہ پر تعریف کرے تو اس کے منہ پر مٹی ڈالو۔ حضرت مدنی رحمتہ اللہ ایک جگہ تشریف لے گئے۔ ایک آدمی جلسہ میں تعارف کروانے لگا۔ اس نے مدحیہ الفاظ شروع کئے تو مولانا نے بہت منع کیا کہ شرع کے خلاف نہ کرو۔ کہ منہ سامنے تعریف نہ کرو بلکہ غائبانہ کرو۔ تو مولانا رحمتہ اللہ علیہ نے مٹی اس کے منہ پر پھینکی اور فرمایا میں اپنے آقاء کا فرمان ادا کر رہا ہوں۔ دوسرے حضرت شاہ جی کشمیری رحمتہ اللہ سورت کے مقام پر ایک بہت بڑے جلسہ میں تشریف لے گئے۔ جلسہ والوں نے سپاسنامہ بھی لکھ رکھا تھا اور قابل تعریف بھی تھے کیونکہ علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ چھ سو سال پہلے ان جیسا عالم نہیں گذرا۔ جب سٹیج پر تشریف لائے تو ایک آدمی تعارف کروانے لگا فرمایا ٹھہرو۔ لوگو میں انور شاہ ہوں بس اتنا تعارف کرا کے فرمایا نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اور تقریر شروع کر دی۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کی کتب کی قدر مصر اور عرب میں بہت ہے۔ مگر دہلی کے بدمعاش لوگوں نے انہیں نہ رہنے دیا۔ شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ، شاہ عبدالقادر رحمتہ اللہ، شاہ رفیع الدین رحمتہ اللہ،

شاہ عبد الغنی رحمتہ اللہ علیہ ان چار بیٹوں اور والد کی مزار دہلی کے قریب ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ کی حجتہ اللہ البالغہ۔ دوست و دشمن دونوں کہتے ہیں کہ اس جیسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر حضرت شاہ عبد القادر رحمتہ اللہ علیہ قرآن کا ترجمہ نہ لکھتے تو کوئی عالم اچھی طرح ترجمہ و تفسیر نہ کر سکتا۔ تو شاہ عبد القادر رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے والد رحمتہ اللہ علیہ کی تعریف میں صرف اتنا لکھتے ہیں کہ میں عبد القادر بن شاہ ولی اللہ ہوں اور وہ میرے والد عالم تھے۔ بس اتنی تعریف کی۔ ایک بار میں دیوبند گیا تو طلباء نے سپاسنامہ پڑھا میں ان کو روک تو نہ سکا۔ ایک واقعہ سنایا کہ اسلام میں سب سے بڑی ہستی حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید ہیں جنکی خستہ تلوار نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کو الٹ دیا۔ اس کے بعد جب فاتحانہ انداز میں واپس آئے تو چاہیے تو تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیا کچھ نہ کرتے۔ اطلاع مل چکی تھی کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ان عظیم سلطنتوں کو فتح کر کے آرہے ہیں۔ تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مسجد میں جمع ہوئے۔ جب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ آئے ہیں جوتوں کی جگہ پہنچے ہیں تو کوئی صحابی رضی اللہ عنہ بھی استقبال کیلئے نہ کھڑا ہوا۔ جب اندر تشریف لائے تو پھر صرف فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بے اختیار کھڑے ہوئے اور معانقہ کیا اور بیٹھ گئے۔ تو سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک جملہ فرمایا جو پورا سپاسنامہ ہے۔ ابشر یا خالد بخیر یوم منذ حاشا یوم الاسلام۔ خالد تمہارے اس سفر میں جو تم جہاد کیلئے گئے

ہیں اللہ کی جانب سے خوشخبری سناتا ہوں کہ ولادت سے آج تک بجز تیرے اسلام کے لانے کے اور کوئی دن اس جہاد کے دن سے بہتر نہیں ہے۔ جواب میں کیا کہتے ہیں وماھذا لک وماانا الا جندی جنود۔ بشارت تو آپکی ہی ہے میں تو ایک سپاہی تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کا کیا معاملہ ہے۔

وہ یہی اسلام تھا جس نے عرب کے پاک خطہ میں تعلیم چھوڑی تو کافی عرصہ اس کا اثر رہا۔ سلطان عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ تو فوت ہو گئے ہیں اب ان کی اولاد ہے۔ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ حج پر تشریف لے گئے فرمایا ایک بات پر بہت خوشی ہوئی ہے کہ سلطان ابن سعود رحمۃ اللہ علیہ ہر سال مخصوص آدمیوں کو دعوت دیتے ہیں۔ دعوت میں ایک بدو آیا اور کہا اسمع یا ابن عبدالعزیز۔ بس اتنا ہی کہا نہ کوئی القاب اور نہ ہی بادشاہ کا اونچ نیچ بیان کیا۔ آفیسر کون ہے؟ یہاں آفیسر وہ ہے جو ایمان پر فوت ہو جائے۔ حضرت امام زین العابدینؒ کو ایک آدمی نے گالی دی۔ تو کسی نے کہا آپ نے کچھ نہیں کہا۔ فرمایا کہ اگر میں ایمان پر مرا تو یہ سب کچھ غلط ہے اور اگر بے ایمان ہو کر مرا تو یہ سب کچھ درست ہے۔ تو تقدیر کا مسئلہ تھا کہ خوفِ مخلوق نہ ہو۔ خوفِ خدا ہو۔ ع

ہر کہ رمز مصطفٰے فہمیدہ است
شرک را در خوف مرزیدہ است

خوفِ مخلوق مٹانیوالی چیز عقیدہ تقدیر ہے۔ عقیدۂ تقدیر یہ کہتا ہے کہ تیری زندگی کے نفع و ضرر خالقِ کائنات کی تقدیر سے وابستہ ہیں نہ کہ کسی مخلوق سے۔ تو جب یہ ڈر اور خوف نکل گیا تو اخلاق رذیلہ کی جڑ نکل گئی۔

(4) فائدہ احراث شجاعت۔ عام طور پر لوگ عربی و دینی تعلیم کو نہ سمجھنے کیوجہ سے یہ کہتے ہیں کہ مسلمان کا تقدیر پر بھروسہ بیکاری ہے۔ لھذا تم ترقی تب کرو گے کہ تقدیر کا عقیدہ ترک کر دو۔ یہ یورپین کا اعلان ہے۔ اس کا جواب ہے لعنۃ اللہ علی الکذبین کیونکہ صحابہ کرامؓ کا تقدیر کا عقیدہ ہم سے زیادہ تر مضبوط تھا۔ اگر تقدیر کا عقیدہ کمزور کرنے والا ہے تو صحابہ کرامؓ کو سست بنا دیتا حالانکہ انہوں نے تقدیر کی قوت سے بڑے بڑے شہنشاہوں کی سلطنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔

آپ کے ملک کا فاتح محمد بن قاسم رحمتہ اللہ علیہ 17 سال کا جوان تھا۔ اور طارق بن زیاد نے سمندر پار کر کے پورے یورپ سے جہاد کیا۔ محمد بن قاسم رحمتہ اللہ علیہ کی پوری فوج 12 ہزار تھی۔ طارق رحمتہ اللہ علیہ کی پہلی ٹولی میں 7 ہزار فوج تھی۔ بعد میں 12 ہزار تھی۔ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی تعداد 12 ہزار ہو تو کمی تعداد کا غم نہ ہو گا۔ طارق بن زیاد رحمتہ اللہ نے سات کشتیوں سے فوج اتاری۔ یورپ کو اس

کا علم تھا پورے یورپ کی فوجیں جمع ہوئیں۔ اور اس وقت یورپ بھی عیاش نہیں تھا۔ جنگی قوم تھی۔ طارق رحمتہ اللہ علیہ نے سوچا پشت پر سمندر ہے آگے چھ ہزار میل لمبا پورا علاقہ دشمن کا ہے۔ مسلمانوں کی ساری امیدیں کچھ تدبیر سے اور بہت سی تقدیر سے وابستہ تھیں۔ تو طارق بن زیاد رحمتہ اللہ علیہ نے کہا آخر آسمانی تقدیر نے اس کا فیصلہ کیا ہو گا۔ فوج کا خیال تھا کہ اگر اور امداد نہ آئی تو کشتیاں تو موجود ہیں واپس چلے جائیں گے۔ تو اس جوان جرنیل نے یہ گوارا نہ کیا کہ اللہ تعالے کے سوا دوسروں پر سہارا کریں تو کشتیاں جلا دیں۔ اور کہا کہ مخلوق کا آخری سہارا مٹ گیا۔ صرف اللہ کا رہا۔ سات ہزار کا پہلا مقابلہ ایک لاکھ کے ٹولے سے ہوا۔ صرف چند جملے فرمائے کہ آگے دشمن ہے پیچھے سمندر ہے جس قدر ہو آگے جانا ہے۔ اگر یورپ والے قیصر و کسریٰ پر جان دے سکتے ہیں۔ تو تم حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر جان نہیں لڑا سکتے۔ تو ایک فوجی نے کہا کہ بس آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہا کہ بس لڑا دو۔ تو صرف ساڑھے تین گھنٹوں میں ایک لاکھ فوج شکست کھا کر بھاگ گئی۔ اس واقعہ کو پنجاب کے ایک شاعر نے فارسی منظوم کیا ہے۔ اس ملک پر ہماری سات سو سال سلطنت رہی۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ وہاں خانہ جنگی بھی ہوئی اور اس دوران فرانس وغیرہ نے حملہ کر دیا تو فرانس نے شکست کھائی۔ تو آخر امتِ مسلمہ کو

ہنگری کے علماؤں نے لڑایا تو عیسائی غالب آ گئے اور وہ ملکِ اندلس جس کی ایک ایک عمارت کی مثال دنیا میں نہیں آج تک اس اندلس پر عیسائی قابض ہیں۔ مگر مسلمان کے فاتح اور عیسائی کے فاتح میں فرق ہے۔ مسلمانوں نے فتح کیا تو عیسائیوں کو امن دیا انکی عزت و آبرو کی حفاظت کی، جان و مال کی حفاظت کی مگر قلم سے تو عیسائی رحم رحم کرتے ہیں لیکن دل میں قینچی ہیں۔ شام، مصر، پاکستان وغیرہ میں ہماری فتح کے باوجود بھی عیسائی موجود اور محفوظ ہیں۔ مسلمان تو لالچی ہیں ہندوستان نے تو انہیں بھگا دیا نہ ان کا گرجا، نہ مشن کوئی چیز ہندوستان میں نہیں۔ تو اندلس کو فتح کرنے کے بعد عیسائیوں نے کیا سلوک کیا۔ اب بھی علمی کتب خانہ اندلس اور سپین کا کتب خانہ پڑا ہے تو فتح کے بعد اعلان کیا گیا کہ او مسلمانو! یا قتل ہو جاؤ، یا باہر چلے جاؤ، یا عیسائی ہو جاؤ۔ کچھ چلے گئے اور کچھ قتل ہو گئے۔ پھر حکم دیا کہ مسلمانوں کے قبرستان مٹا دو۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ یہ بد قسمتی کے دن کب تک رہیں گے کہ آپس میں نہ لڑا کرو کہ ہم خانہ جنگی کیوجہ سے کمزور نہ ہو جائیں۔ تو محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ ہند اور طارق ابن زیاد کی کامیابی ہسپانیہ یہ عقیدۂ تقدیر کیوجہ سے ہے۔ کہ آدمی جنگ میں موت سے ڈرتا ہے۔ تو عقیدہ یہ سکھاتا ہے کہ موت کا وقت نہیں ٹلتا۔ جب ٹلتا نہیں تو موت کے دریا میں غوطے لگاؤ۔

وما کان لنفسٍ ان تموت الا کتابًا مؤجلاً۔ فاذا جاء اجلھم لایستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔ نہ ایک سیکنڈ آگے نہ پیچھے۔ جس کے دل میں یہ عقیدہ ہو تو وہ توموت کے میدان میں کود پڑیگا۔ صحابہ کرامؓ کو یہی عقیدہ عروج پر لے گیا۔ قرآن نے تدبیر کے متعلق فرمایا ہے ہم اس سے دور کیوں ہوں۔ قرآن نے کہا کہ تم دشمن کے مقابلہ میں کثیر تعداد میں آلاتِ جنگ بناؤ حاصل کرو تو وہ دیکھ کر ڈر جائیں۔ حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے استاد عامر شعبی رحمتہ اللہ علیہ کو قیصر کا سفیر بنایا گیا۔ ان سے ایک عیسائی نے سوال کیا کہ آپ کے ہاتھ کھردرے کیوں ہیں۔ فرمایا ہم تو غازی ہیں، تلوار چلانے والے ہیں، ہمارے ہاتھ مضبوط ہونے چاہیں۔ تو اس نے آپ کو ایک خط دیا کہ یہ اپنے امیرالمومنین کو بھیج دو۔ اس میں لکھا تھا کہ جس ملک میں ایسے فاضل شخص ہوں تو دوسرا کیونکر امیرالمومنین بن سکتا ہے۔ عامر رحمتہ اللہ علیہ جب خط لے آئے تو امیرالمومنین نے فرمایا کہ اس نے آپ سے میرے تعلقات خراب کرنے کیلئے لکھا ہے۔ عامر شعبی رحمتہ اللہ علیہ نے فوراً جواب دیا کہ انہ مایراک ولولخ کہ اس نے مجھے تو دیکھا ہے آپکو نہیں دیکھا۔ اگر آپ کو دیکھتا تو یہ تحریر نہ ہوتی۔ خیر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ تو تقدیر کے عقیدہ کا دوسرا فائدہ شجاعت اور بہادری ہے۔ مسلمان کی ہر قوم سے جنگ ہوئی ہے۔ عرب خود عربوں سے لڑے تو کامیاب

ہوئے۔ یعنی مسلمان کامیاب اور کفار شکست کھا گئے۔ یہ صرف عقیدۂ تقدیر تھا کہ پوری بہادر قوموں کو شکست دی۔ مزید وضاحت دوسرے درس میں دونگا۔

درس نمبر ۱۱
17 اکتوبر 1966ء

مقصدِ اعضاء

اس آیت کی باقی تقریر تو ختم ہو چکی ہے اب چند چیزوں کا بیان باقی ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ ان کافروں کے دلوں و کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ہیں اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ انسان کے پاس یہ تینوں ہدایت کے دروازے ہیں۔ قلب، سمع، بصر تینوں کو اللہ نے کسی خاص مقصد کیلئے بنایا ہے۔ اور وہ اصلی مقصد ہے باقی مقاصد ان سے انسان ضمنی طور پر لیتا ہے۔ بلکہ دنیا کی ہر چیز میں اللہ نے ایک اصلی مقصد پیدا کیا ہے۔ اور ضمنی اور کام بھی ہوتے ہیں۔ تو اللہ نے قلب کو حق و باطل کے امتیاز کیلئے پیدا کیا ہے۔ اور پھر ضمنی طور پر یہ کہ قلب کے ذریعہ دنیا کے کاروبار میں بھی تجویزیں بنا سکتا ہے اور تدابیر سوچ سکتا ہے۔ تو اصل مقصد حق و باطل کا فرق و تمیز اور ضمنی مقصد دنیوی فوائد کی تدبیر و تجویز ہوئی۔

(1) یہی معاملہ کان کا کہ انسان کے کان کو اللہ

تعالے نے پندو موعظت و تبلیغ وغیرہ کے سننے کیلئے بنایا ہے۔ اور ضمنی طور پر اس سے دنیاوی باتیں بھی سنتے ہیں۔ لیکن اللہ نے کان کو شریعت کے سننے کیلئے بنایا ہے۔

آنکھ بھی اسی طرح ہے۔ کہ آنکھ اس لئے پیدا کی ہے کہ آپ قرآن و حدیث و بزرگان دین کی ملفوظات پر نظر ڈالیں اور اس کے ذریعہ قرآن و حدیث و اللہ والوں کا فیض دل میں کھینچیں۔ لیکن اس کے علاوہ آنکھ سے ضمنی طور پر دنیا کی ہر بھلائی اور برائی دیکھتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور پر نظر ڈالتے تھے تو پورا فیض حاصل کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ آنکھ سے ضمنی طور پر تعلیم وغیرہ بھی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ دنیا کا فائدہ بس قبر تک ہے اور آخرت کا فائدہ ابدالاباد تک ہے۔ بس میں نے قلب، سمع و ابصار کی تخلیق کا مقصد بیان کیا ہے۔ اب یقینی بات ہے کہ اللہ تعالے نے ان تینوں کا جو اصلی مقصد بنایا ہے۔ انسان اس کو چھوڑ کر ضمنی مقصد میں صرف کرے تو یہ نادانی ہے۔ ہاں اصل مقصد کے علاوہ ضمنی مقصد بھی حاصل کرو تو یہ درست ہے۔ اور اگر بالکل ضمنی مقصد حاصل کرو تو یہ بدبختی ہے۔ جوتا پاؤں کی حفاظت کیلئے بنایا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ ایک جگہ بیٹھے ہیں تو اتفاقاً ایک بچھو نکل آیا۔ تو آپ اس

کو جوتا مار سکتے ہیں۔ آپ یہ دونوں طریقے جانتے ہیں۔ لیکن پاؤں میں استعمال کرنا اصل مقصد ہے اور بھو مارنا ضمنی مقصد ہے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ نے اپنے کارخانہ میں انسان کا قلب، کان اور آنکھ بنائے ہیں۔ ان کا ایک خاص مقصد ہے لیکن ضمنی طور پر بھو کی طرح دنیا کا مقصد بھی حل کر سکتے ہیں۔ اب اگر ایک آدمی پاؤں کی بجائے جوتے کو کپڑے میں بند کر کے بغل میں رکھے کہ اس سے بھو کو مارونگا۔ کیا یہ بیوقوفی نہیں؟ کہ اصل مقصد فوت ہو گیا اور ضمنی مقصد پر نظر رکھتے ہو۔ یہ بیوقوفی ہے۔ آج کل ساری دنیا اس درجہ کی بیوقوف ہے۔ کہ خداداد طاقتیں جس مقصد کیلئے دی گئی ہیں۔ اس کو تو ہاتھ نہیں لگاتے بس دنیا کی ناولیں وڈرامے وغیرہ پڑھتے رہتے ہیں۔ اس حماقت اور نادانی کیوجہ سے دنیا قرآن وحدیث سے دور ہے۔

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ یہ بزرگانِ دین کا مقولہ ہے۔ اب روحانیات کے لحاظ سے درجے ہیں۔ ایک صحت اور دوسرا غیر صحت کا درجہ۔ اللہ تعالےٰ کے علاوہ سب چیزیں تغیرات ہیں۔ تو ایک ہے صحت قلب کہ قلب درست ہو دوم ہے فسادِ قلب کہ دل کا بگڑ جانا۔ قوتِ سمع کے بھی دو درجے ہیں 1۔ صحتِ سمع، 2۔ فسادِ سمع۔ اسی طرح بصر کے بھی دو درجے ہیں 1۔ صحتِ بصر، 2۔ فسادِ بصر۔ یہی حق جو حضرت نبی کریم صلے اللہ

علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں پیش کیا۔ تو مکہ کے اصل باشندے جو پیغمبری سے قبل شرک و کفر والے دین پر تھے جب بعثت ہوئی تو یہ قرآن پیش کیا اور قرآن کا سمجھنا دل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس قرآن کو ابوبکرؓ و عمرؓ نے بھی سنا اور ابوجہل وغیرہ نے بھی سنا۔ دونوں عرب کے گروہ ہیں۔ ایک ہی قبیلہ کے ہیں اور ایک ہی قرآن ہے مگر جن کا قلب بیمار تھا وہ ساری عمر دل کو دنیا میں لگاتے رہے ہیں اور قرآن سے ہدایت نہ پائی۔ اور جن کے قلب درست تھے وہ ہدایت پا گئے۔ یضل بہ کثیرا و یھدی بہ کثیرا۔ اس قرآن کیوجہ سے کوئی گمراہ اور کوئی حق پر آئیں گے۔ کیا آج کل مرزائی ان آیات کو نہیں پڑھتے۔ مثال، تپ محرقہ، بخار کی ایک بیماری۔ اب ایک تندرست آدمی اگر دہلی والا سوہن حلوہ کھاتا ہے تو وہ خوب موٹا بن جاتا ہے۔ لیکن اگر بخار والے کو دیدو تو بیمار ہو جائے گا۔ ہے ایک ہی سوہن حلوہ۔ اسی طرح روحانی مزاج کی بھی دو قسمیں ہیں۔ 1۔ تندرست، 2۔ مریض۔ بوعلی سینا، اشارات اور شفاء میں لکھتے ہیں کہ کبھی ایک بہتر چیز کے دو متضاد اثرات ہوتے ہیں جبکہ اس کے متقابل دو چیزیں ہوتی ہیں۔ مثال کہ تالاب پر دھوبی تختے پر کپڑا مار رہا ہے نیچے پانی اور اوپر دھوپ۔ یقینی بات ہے کہ پانی اور دھوپ ایک ہے اور دھوبی کا مزاج الگ ہے کہ وہی پانی اور دھوپ کپڑے کو تو سفید کر رہا ہے مگر دھوبی کو سیاہ کر رہا ہے۔ تو مطلب

ہے کہ سیاہی اور سفیدی دو متضاد اثرات ہیں۔ مگر پانی اور سورج نے دھوبی کو سیاہ اور کپڑے کو سفید کر دیا۔ تو اسی طرح جو قلب مریض ہیں وہ قرآن سے خراب ہو جاتے ہیں۔ اور جو صحت مند قلب ہیں وہ اچھے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سمع کہ ایک مقرر صحیح تقریر کرتا ہے تو جو تندرست کان رکھتے ہیں وہ مکمل طور پر فائدہ اٹھاتے ہیں اور جو کان مریض ہیں وہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ مولانا طیب رحمتہ اللہ علیہ دیوبند والے قلات میں تشریف لائے۔ عمدہ تقریر کی تو والیٔ قلات نے خوب تعریف کی۔ لکن قاضی محمد عیسیٰ صاحب مسلم لیگ والے کہنے لگے کہ تقریر میں نقص تھا۔ میں نے قاضی صاحب سے کہا آپ کیا چاہتے ہیں کہ قاری صاحب کی تقریر سب کو پسند ہو۔ اگر یہ کہیں کہ سب کو پسند ہو تو یہ تو آپنے قاری صاحب کو خدا سے بھی بڑھا دیا۔ دیکھو قرآن خدا کی تقریر ہے۔ کسی نے پسند کی ہے اور کسی نے نہیں۔ مقرر کو بھی چاہیئے کہ حق بات کہدے۔ چاہے بندہ کو پسند ہو یا نہ۔ اب تو ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ مقرر میرے دل کی بات کہے۔ جنکی قوتِ سمع درست ہے انہوں نے حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دین سے فائدہ اٹھایا ہے اور جو مریض سمع والے ہیں وہ گمراہ ہو گئے ہیں۔ آنکھ کو دیکھو کہ اسی آنکھ سے قادیانی بھی قرآن کا مطالعہ کرتا ہے اور مسلمان بھی۔ مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مجھے سید عطاء اللہ شاہ رحمتہ اللہ کی بات یاد

آئی کہا کہ میرے پاس ایک آدمی تبلیغ کیلئے آیا گروہ غیر مسلم تھا۔ مین نے کہا کہ میرا دین یہ ہے اور اپنے گذرے ہوئے سب بزرگانِ دین کے نام سنا دئے اور کہا کہ اگر قیامت کے دن اللہ کہے کہ تو کونسی ٹولی میں کھڑا ہو گا تو میں بزرگان کی صف میں کھڑا ہوں گا۔

یہ درست ہے کہ سر سید احمد خاں رحمتہ اللہ علیہ مسلمانوں کا دوست تھا مگر تفسیراتِ احمدیہ انہوں نے غلط لکھی ہیں۔ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ مسلمانوں کا نادان دوست تھا۔ انہیں چاہیے تھا کہ مسلمانوں کی بھلائی تو کرتے مگر دین کو نہ تراشتے۔ سر سید صاحب نے اپنی تفسیر مولانا ابوالکلام آزاد رحمتہ اللہ علیہ کے پاس بھیجی اور کہا کہ اپنی رائے دو۔ تو مولانا رحمتہ اللہ علیہ نے ایک فقرہ لکھا۔ کہ تفسیر دیکھی معلوم ہوا کہ میں سب سے کٹ کر آپ سے جڑ جاؤں۔ یعنی بزرگانِ دین سے کٹ کر۔ لیکن میں آپ سے کٹ کر سب سے جڑ جانے کو بہتر سمجھتا ہوں۔ میرا یہ خیال ہے کہ یہ ایک جملہ انسان خود بھی سیکھ لے اور بچوں کو بھی سکھائے تو قیامت تک اولاد مسلم گمراہ نہ ہو گی۔ نگاہ نگاہ کا بھی فرق ہے مثلاً باغ کو انگریز بھی دیکھتا ہے اور شیخ سعدی رحمتہ اللہ بھی۔ شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ جب پھول پر نظر ڈالتے ہیں تو بے ساختہ یہ شعر نکلا۔ ع

پھول مٹی کے ذرے ہیں اور پانی ملا تو کچھ گلاب کا

پودا اور کچھ گلاب کی پتی اور کچھ گلاب کا پھول پھر رنگ کس کارخانے سے آیا۔ (رنگ بھی پودوں سے بنتے ہیں)

برگ درختانِ سبز در نظر ہوشیار
ہر ورق دفتریست معرفتِ پروردگار

نفحات الانس میں عارف جامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ایک بزرگ نے حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ تو حضرت سعدی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ جن چیزوں پر جو اعتماد تھا ان سے کچھ تو بنا۔ مگر اس شعر کیوجہ سے میں بخشا گیا۔ ایک بزرگ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ کے خلاف تھے۔ انہیں حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ آپ کے دربار نورانی شکل کے آدمی ہیں جو بڑے بڑے تھال لے جا رہے ہیں۔ تو اسی بزرگ نے پوچھا کہ یہ کہاں لئے جا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ سعدی رحمۃ اللہ کیلئے ہیں اس نے جو رباعی بلغ العلی بکمالہ لکھی ہے وہ مجھے پسند ہے۔ ایک دفعہ میرا ایک معتقد دوست آیا جو سارا یورپ پھرا ہوا تھا۔ میں نے اس سے سینما کے متعلق معلومات دریافت کیں تو اس پر میں نے کہا جس طرح گویا سینما کی تصاویر متحرکہ ایک جہان ہے جو انسانوں پر خوشی اور غمی لاتا ہے لیکن اگر وہ مشین بند ہو جائے تو خاموشی ہے۔ اسی طرح عرش سے فرش تک تصویریں ہیں اور اللہ تعالے کی تجلی مشین ہے جب تجلی والی مشین

ختم ہوئی تو پھر سب کچھ ختم ہے۔ بزرگان کا ایک مقولہ یہ ہے کہ مہر دو طریقوں سے لگتی ہے۔ تعطل اور تضاد اللہ تعالے نے جس عضو کو جس مقصد کیلئے رکھا ہے اگر اس کو اس مقصد میں نہ لگایا جائے تو وہ عضوء بیکار ہو جاتا ہے مثلاً ایک آدمی روزانہ بیس میل سفر کرتا ہے اس کا پاؤں باکار ہے اور لمبی مسافت طے کر سکتا ہے۔ اور دوسرا آدمی بیٹھا رہا اور عضوء کو مقصد میں تصرف نہ کیا تو اس کا پاؤں بیکار ہو گیا کہ وہ ایک میل بھی نہیں چل سکتا۔ اسی طرح قرآن کہ اگر حفظ کریں تو دماغ کو مقصد پر لگایا اور دماغ باکار ہوا۔

محمد ابن قلبی رحمتہ اللہ علیہ نے سارے قرآن کو تین دن میں یاد کیا بہت ذہین تھے۔ شاید کچھ غرور ہوا ہو گا کہ جمعہ کے دن داڑھی کو درست کرتے تھے مٹھی بھر سے جو بال بڑھ جاتے انہیں کتر دیتے۔ ایک مرتبہ اپنی داڑھی ایک ہاتھ سے پکڑ رکھی تھی دوسرے ہاتھ سے جب کترنے لگے تو بھول کر قینچی مٹھی کے اوپر کر لی تو داڑھی کتر بیٹھے۔ تو فرمانے لگے میری قوت حافظہ پوری دنیا کے انسانوں سے زیادہ ہے اور بھول بھی زیادہ ہے۔ تو اللہ تعالے نے قلب حق و باطل کے امتیاز کیلئے دیا ہے۔ اگر اس سے یہی کام لیں گے تو درست رہیگا۔

درس نمبر۱۲
14اکتوبر1966ء

پہچانِ حق واَسبابِ مُہر

ختم اللہ علی قلوبہم الخ پر آج آخری درس ہے۔ اللہ تعالے کا ارشاد ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ان کے قلوب اور کانوں پر مہر ہے اور آنکھوں پر پردے ہیں اب وہ حق نہ سمجھتے نہ سنتے اور نہ دیکھتے ہیں تو لازمی نتیجہ ولہم عذاب عظیم ہے۔ انسان کے اندر مختلف چیزیں ہیں کچھ ظاہری اور کچھ پوشیدہ۔ ظاہر آنکھ کان وغیرہ ہیں۔ اور پوشیدہ انسان کے اندر تمام مخلوقات سے جداگانہ حق کی پہچان کیلئے ایک سمجھ پیدا کی۔ یعنی قلب اور اس کے کان میں ایک ایسی قوت رکھی ہے جس سے حق اور باطل میں فرق کر سکتا ہے۔ اسی طرح آنکھ جو حق اور باطل کو پہچان سکتی ہے۔ جس طرح ظاہری اعضاء مریض ہو جاتے ہیں اسی طرح باطنی اعضاء بھی مریض ہو جاتے ہیں۔ اور طبی اصول یہ ہے کہ جس عضوء کا جو کام ہوا گر وہ اپنا کام سرانجام نہ دے سکے تو یہ مرض ہے۔ تو قلب بھی ایک مقصد کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ جسمانی اور روحانی مریض کا علاج الگ

الگ ہوتا ہے۔ اور مرض بھی الگ الگ ہوتی ہے۔ روحانی مرض قوی تھی تو اللہ تعالے نے آسمان سے پیغمبر علیہ السلام حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو بھیجا تا کہ علاج کرے۔ جسمانی مرض کا نقصان صرف دنیا تک ہے اور روحانی مرض کا نقصان قبر، دنیا اور آخرت تک ہے۔ تو فرمایا لایومنون تو اللہ تعالے نے یہ فرمایا کہ وہ اس حد تک مریض ہو چکے ہیں کہ اب علاج نہیں ہو سکتا۔ ایمان نہیں لائینگے اب ان کا مرض قبر و آخرت تک ساتھ جائیگا، تندرستی کی کوئی تجویز نہیں۔ اب قابل غور یہ بات ہے کہ ختم کی مرض کہاں سے پیدا ہوئی۔ یعنی ناقابل علاج مرض کے اسباب کیا ہیں۔ تا کہ مسلمان ان اسباب سے بچ کر بدانجام سے محفوظ ہو جائے۔

1۔ پہلا سبب کہ قلب علاج قبول نہیں کرتا۔

حدیث شریف سے معلوم ہے کہ ایک تکرارِ معصیت کہ بار بار گناہ کرنا اور متنبہ نہ ہونا۔ یعنی کسی قسم کی ندامت نہ کرنا۔ حجتہ اللہ البالغہ میں بڑی تحقیق کی ہے۔ کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ گناہ آیا اور گیا۔ فرمایا نہیں گناہ اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ مثلاً دس منٹ زنا کیا تو وہ دس منٹ کا اثر اگر خاص انتظام نہ کیا تو اس کا اثر آخرت تک جائیگا۔ تو گویا گناہ سے دل متاثر ہوتا ہے۔ اور ساتھ میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ نے فرمایا کہ آدمی ایک بھول کر گناہ کرتا ہے مثلاً بھول کر پانی پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر کوئی قصداً پانی پی لے تو گناہ بھی اور روزہ

بھی ٹوٹ گیا۔ تو شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے بحث کی ہے کہ کام تو ایک ہے کیا اس بھول کا قلب پر اثر پڑیگا۔ فرماتے ہین اگر جان کر کھایا تو گناہ بھی ہوا اور قلب پر سیاہی بھی چڑھی۔ اور اگر بھول کر کھایا تو سیاہی بھی نہیں چڑھی اور گناہ بھی نہیں ہوا۔ گوشت کے لوتھڑے قلب کے اندر ایک نور ہے جو روحانی قلب ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے عجیب مثال دی ہے کہ کام ایک ہے مگر بھول کیوجہ سے گناہ نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ قصد اور ارادہ روح کیلئے بمنزلہ حلق کے ہیں۔ یعنی وہ گلا جس سے پانی یا نوالہ نیچے اترتا ہے۔ اب یقینی بات ہے کہ اگر ایک آدمی کے بدن پر کھانے پینے کا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً خمیرہ مروارید اگر ہاتھ میں دبائے رکھا تو بدن پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر حلق سے اترے تو یہ اثر کرتا ہے۔ اسی طرح اگر پیاسا پانی ہاتھ میں لئے رکھے تو پیاس نہ بجھے گی۔ بلکہ پینے سے بجھے گی۔ تو شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر آدمی بھول سے گناہ کرتا ہے اور گناہ زہر ہے لیکن اس کو ایسا سمجھو کہ زہر ہاتھ میں ہے نہ کہ حلق سے اتری ہے۔ اسی طرح گناہ ایک زہر ہے جب حلق سے گذرے تو جانو کہ اس نے قلب کو سیاہ کر دیا ہے۔ تو میں نے کہا کہ انسان کا قلب کبھی بیمار ہوتا ہے اور مرض کبھی لاعلاج بھی ہوتا ہے اور وہ اس طرح ہوتا ہے کہ بار بار گناہ کرنا اور متنبہ نہ ہونا۔ دیکھو جب انسان شروع میں گناہ کرے تو دل

میں دھڑکن ہوتی ہے اور بے چینی ہوتی ہے۔ لیکن بار بار کرنے سے دل سیاہ ہو جاتا ہے اور پھر وہ اس گناہ پر فخر کرتا ہے۔ اور گناہ کے اعلان سے شرماتا نہیں۔ یہ دلیل ہے کہ سیاہی بڑھ گئی۔ اللہ تعالےٰ کا بڑا احسان ہے کہ وہ مومن کو جنت میں لے جانا چاہتا ہے۔ تو جب کوئی گناہ ہو جائے تو ایک روحانی صابن تجویز کیا گیا ہے وہ ہے استغفار اور توبہ ہے جس سے قلب دوبارہ چمک اٹھے گا۔ اذا اذنب العبد نقطت فی قلبہ نقطۃً سوداء فان تاب رفعت الخ گناہ سے دل میں سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے جو بار بار کرنے سے بڑھتے جاتے ہیں۔ اگر توبہ کر لی جائے تو پھر چمک جاتا ہے۔ مسلم شریف میں ہے التائب من الذنب کمن لاذنب لہ توبہ کرنیوالا ایسا ہوتا ہے جیسے اس نے گناہ نہ کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ختم اللہ علی قلوبھم الخ والے وہ لوگ تھے جو بار بار گناہ کرتے اور ندامت نہیں کرتے تھے بلکہ فخریہ اعلان کرتے تھے۔ دل کے سیاہ ہونیکا دوم (2) سبب اتباعِ رسم۔ انسان کا مزاج ایک عجیب چیز ہے۔ انسان جب دیکھتا ہے کہ لوگ فلاں کام کو کافی عرصے سے کرتے چلے آرہے ہیں تو انسان کے قلب میں اس کام کی عظمت بیٹھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو عرب کثیر تعداد میں لات و منات اور ھبل کی بت پرستی کرتے تھے۔ تو انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ جس کام کو بہت لوگ کافی

لمبے عرصے سے کرتے چلے آرہے ہوں وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اب قرآن نے اسے شرک سے روکا تو وہ اس قدیم اتباعِ رسم کو چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ یہی بات ہے کہ جب انگریز شروع میں آئے تو ان کی ہر چیز بری معلوم ہوتی تھی۔ ہمارے قصبہ میں ایک مسلمان انگریز کے ساتھ ہیٹ پہن کر آیا تو تمام بچے گھروں میں چھپ گئے کہ ہیٹ کو دیکھ کر جہنم میں نہ جائیں مگر اب بار بار دیکھنے کے بعد کوئی اثر نہیں۔

اقبال رحمۃ اللہ:ع

جو تھا نہ خوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

وانزل المیزان۔ خدا نے ایک قرآن والا ترازو اتارا ہے۔ یورپ اور امریکہ سے کوئی قانون آئے تو قرآن پر تولو اگر وہ درست نکلے تو اپناؤ ورنہ اس پر لعنت دو۔ اتباعِ رسم گویا ایک عجیب چیز ہے۔ یہ ابتدائی بات تھی۔ جب ایک انگریز ابتداء میں افغانستان میں آیا تو اس کو دیکھنے کیلئے لوگ جمع ہو گئے کہ اس کے سر پر ٹوکرہ رکھا ہوا ہے۔ قبائلی لوگوں میں بہت سے ہیٹ والے مسلمان قتل کئے گئے۔ ایک صاحب نے ہیٹ کے بارے میں پوچھا کہ اس کا پہننا جائز ہے یا ناجائز۔ میں نے کہا کہ اس ہیٹ کے

ساتھ کسی پرندے کا پر یا کوئی اضافی کپڑا لگا دو تو بس پھر کچھ نہیں کیونکہ پھر یہ ہماری ٹوپی ہو جائیگی نہ کہ انگریز کی۔ ورنہ شریعت میں تو بات یہ ہے کہ مرد کے استعمال کیلئے خالص سرخ رنگ اور ریشم منع ہے۔ باقی جس طرح کا کپڑا ہو درست ہے۔ لیکن اسلام نے یہ کہا ہے کہ من تشبہ بقوم فھو منھم۔ جو اپنی شکل تہذیب و تمدن جس قوم سے بنائیگا قیامت میں اسی قوم کے ساتھ حشر ہو گا۔ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو تشبہ کی ممانعت فرمائی ہے تو پہلے آپکے مقصد کو جاننا ضروری ہے۔ ایک تشبہ مشترکاً ہے مثلاً انگریز کھاتے پیتے ہیں۔ ہم بھی کھاتے پیتے ہیں۔ ان چیزوں میں کفار سے مشابہت نہیں ہوتی۔ یہ تشبہ لوازماتِ بشریہ میں سے ہے اسکی اجازت ہے۔ یہ نہیں کہ انگریز کھاتے پیتے ہیں ہمیں نہ کھانا چاہیے۔

2۔ دوم امور مذہبیہ۔ جس طرح ہندو ذوالنار یعنی پیشانی پر سرخ نشان لگاتے ہیں۔ یا عیسائی جو صلیب کی شکل میں ٹائی پہنتے ہیں ان مذہبی چیزوں میں ان کی مشابہت حرام ہے۔

3۔ تیسری چیز تشبہ امور تمدنیہ جو بین بین ہیں جیسے کوٹ پتلون یہ خاص انگریزوں کی نہیں ہیں کیونکہ ترک قوم اس کو بہت پہلے استعمال کرتی چلی آئی ہے۔ بہرحال ہیٹ حرام تو نہیں مکروہ ہے تو مکروہ کے بچنے کیلئے کوئی پر وغیرہ لگا دو۔ تشبہ کی ممانعت کیوں کی؟ اس کی ایک مختصر حکمت بیان کرتا ہوں۔ کہ

اس سے احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔ کہ انگریز کو اعلیٰ اور خود کو پست سمجھنے لگتے ہیں اور وہ قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی جو احساس کمتری رکھے۔ اچھوتوں کو دیکھو کہ اونچے درجہ کے ہندوؤں میں نہیں جاسکتے اور نہ ان کے کنوئیں سے پانی پی سکتے ہیں۔ اگر ہم نے انگریز کو اونچ اور خود کو نیچ کا خیال کر لیا تو پھر مسلمان کا جنازہ نکل گیا۔ مگر قرآن نے کنتم خیر امتہ فرمایا ہے کہ تم سب سے بڑی قوم ہو۔ اور مسلمان کے بچے سے بڑھکر کوئی نہیں۔ یہ درست نہیں کہ پہناوا بھی انگریز کا اور تہذیب بھی انگریز کی اور دیکھو مصیبت یہ کہ کھیل بھی انگریز کا ہے۔ چلو کھیل نہیں کرتے اس میں کچھ ترمیم تو کرلو۔ والئی قلات نے کہا کہ کھیل کیسی چیز ہے میں نے کہا ورزش ہے ثواب ہے۔ مگر انگریز کی نقل نہ کرو اپنا ایجاد کرو۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ اگر مسلمان اپنا ایجاد کرے تو اس میں کم گناہ ہے اور اگر انگریز سے نقل کرکے کرے تو ڈبل گناہ ہے۔ ایک خود گناہ دوسرا مشابہت کا گناہ۔ انگریز پہلے آئے تو لوگوں نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ سے پوچھا کہ اسلام کب زندہ ہو گا۔ فرمایا کہ اسلام شرکت نہیں چاہتا۔ تمام قوموں کے قانون توڑ دو اور اسلام کے قانون اور رسم و رواج کو اپناؤ۔ عالم اسلام پر برطانیہ نے اتنا ظلم کیا ہے کہ آدم علیہ السلام سے لیکر آج تک کسی کافر قوم نے نہیں کیا۔ ترکیہ کی سلطنت الجزائر سے لے کر کتنی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ مگر انگریز

سلطنت نے اسے پارہ پارہ کر دیا۔ قبرص وغیرہ چھین کر عیسائیوں کو دیا اور اسرائیل کو عرب پر اکسا رہے ہیں۔ نائیجیریا، مصر سے بڑا ہے جب گئے تو مسلمانوں کو قتل کیا۔ ابھی انڈونیشیا میں انقلاب آیا دس لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ کیا کشمیر کا مسئلہ اسی انگریز نے نہیں الجھایا؟ اب بھی اس قوم سے نفرت نہ ہو گی۔ اس کا ہیٹ لیکر بازار میں سرعام پیشاب کرو۔ اللھم العن علی قوم برطانیہ۔

اے اللہ برطانیہ اور تمام انگریزوں پر تیری بیشمار لعنتیں ہوں۔ ہر قوم کا اپنا ایک لباس ہے۔ روس قوم کا لباس اگر امریکہ کی فوج پہنے تو جرمدار اور بغض کی نشانی ہو گی۔ ہمارا لباس اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ولباس التقویٰ ذٰلک خیر۔

دیکھو اچھوت نے اپنے آپ کو کھتری میں مبتلاء رکھا تو مر گئے ہیں کچھ لے نہ سکے۔ اور سکھ زندہ قوم ہے ان میں یکجہتی ہے۔ اس لئے ہندو قوم انہیں الگ صوبہ دینے پر مجبور ہے۔ تم اپنی طرزِ زندگی پر چلو۔ اسکو اپناؤ۔ کیا تمام عالم اسلام کی مشکلات کا واحد ذمہ دار برطانیہ ہے؟ اسے خدا تعالے سزا دے گا اور عنقریب دینے والا ہے۔ دیکھو یہ بھی عذاب ہے کہ روس روزانہ چڑھ رہا ہے اور انگریز روزانہ ختم ہو رہے ہیں۔ اقبال ع

دینِ کافر فکر و تدبیر و جہاد
دینِ ملا فی سبیل اللہ فساد

ہم میں غیرت نہیں ورنہ جو مولوی مسلمانوں کو لڑانا چاہے تو اس کی ٹانگ سے پکڑ کر نیچے اتارو ورنہ اگر یہی حالت رہی تو اچھوت والی حالت ہو جائیگی۔ اور قرآن کے غلط معانی کر کے بگاڑتے ہیں۔ اقبال ع

کہ جب بھی مولوی نے غلط معنی کیا تو خدا اور مصطفٰی اور خدا کا جبرائیل حیران ہو جاتے ہیں کہ ہم نے یہ تو نہیں کہا تھا بلکہ واعتصموا بحبل اللہ جمعیا کہا تھا۔ تو ایک چیز تشبہ اور دوسری چیز ہے اتباعِ بدرسم اور (3) تیسری چیز ہے صحبتِ بد۔ انسان کا قلب تب کالا ہوتا ہے جب اس کا تعلق کالے قلب والوں کے ساتھ ہو۔ قرآن یوم یعض الظالم علی یدیہ جب انسان اپنے ہاتھ کاٹے گا تو پھر حشر کے دن بولے گا کہ یااللہ حق آنے کے باوجود اس نے مجھے کیسے بہکا دیا۔ حدیث الرء علی دین خلیلہ آدمی اپنے دوست و احباب کے دین سے اٹھے گا۔ اس لئے صحبت بد قلب کو سیاہ کرنیوالی ہے۔ تم میں سے ہر ایک دیکھ لے کہ ہم کس قسم کے لوگوں سے صحبت کرتے ہیں۔ اگر بد لوگوں کی تصنیف کا مطالعہ کروگے تو نتیجہ بد صحبت والا ہوگا۔ یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصٰدقین اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور ان کے ساتھ رہو جن کا دین سچا ہے۔

درس نمبر ۱۳
16اکتوبر 1966ء

قلب پر مُہر بدبختی ہے

یہ دل پر مہر کا لگ جانا بڑی بد بختی ہے۔ یہ دل ہی انسانی زندگی کی کامیابی اور ناکامیابی کا مدار ہے۔ مہر بمعنی یہ کہ نیکی کا دروازہ بند ہو جائے۔ سابق درس میں مہر لگنے کے تین اسباب ذکر کئے تھے آج -4- چوتھا سبب وہ ہے غفلت عن الموت کہ موت سے غافل ہونا۔ جس قدر آدمی موت سے غافل ہوتا ہے اسی قدر گناہ پر دلیر ہوتا ہے۔ اور جس قدر موت سے ڈرتا ہے اسی قدر نیکی کرتا ہے۔

موت حقیقت میں دنیا سے آخرت کی طرف جالان ہے۔ جب جالان ہوا تو یہاں کی سب چیزیں غائب اور وہاں کی سب چیزیں ظاہر۔ اگر یہ نقشہ ہر وقت ذہن پر رہ جائے تو کیا گناہ ہو سکتا ہے؟ اذکروا اذکرواھا ضتم الذات۔ تم اس چیز کو یاد کرو جو تمام مزوں کو مٹا دینوالی ہے اور فرمایا موت کے یاد کرنے میں دل کا نور بڑھتا ہے اور خیر اور نیکی کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ اور قرآن نے

موت کی شکل ایک عجیب طریقہ سے فرمائی ہے۔ کل نفس ذائقۃ الموت۔ وانما توفون اجورکم یوم القیمۃ۔ فمن زحزح۔ فما الحیوۃ الدنیا الامتاع الغرور۔ جب موت کا خوف نہیں ہو گا تو دل پر مہر لگ جائیگی۔ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان کہ اگر قبرستان سے گذرو تو یہ کہو کہ تم پر سلام ہو تم ہمارے سلف ہو اور ہم بھی عنقریب آنیوالے ہیں۔ شعر

یکے بگور غریباں شہر سیر کن
ببیں کہ نقش عمل ہا چہ باطل عقد است

کہ قبرستان کی سیر تو کرو دیکھو کہ کتنے امید کے نقشے مٹ چکے ہیں۔ موت ہر ایک کو آنیوالی ہے۔ موت ہر شاہ و گدا کی تعبیر ہے۔ موت کے یاد کرنے سے مہر لگنے کے تمام خطرات زائل ہو جاتے ہیں۔ حقیقت میں موت روزانہ آتی ہے۔ النوم اخو الموت کہ نیند موت کا بھائی ہے۔ ہمیں روزانہ نیند کی شکل میں موت آجاتی ہے اور صبح میدانِ حشر معلوم ہوتا ہے۔ تو یہ جانو کہ موت کا خواب بھی ایک دن آئے گا۔ اور اللہ کے ہاں پیشی ہو گی۔ اور ہمارے اعمال کی پوچھ پاچھ ہو گی۔ کسی نے حضرت مکی رحمۃ اللہ سے پوچھا کہ قلب میں سختی آگئی ہے فرمایا موت کا مراقبہ کرو۔ کہ سونے سے قبل کل نفس ذائقۃ الموت کا تصور قلب پر لاؤ جب ہر جاندار کو موت آئیگی تو میں بھی جاندار ہوں مجھ پر بھی آئیگی۔ اور

پھر وقت بھی مقرر نہیں۔ اور جب وقت مقرر نہیں تو روزانہ ہر دن کو موت کا دن سمجھو۔ اور موت کے بعد پوچھ کا دن ہے کہ دنیا میں کیا کیا۔ جب پوچھ کا وقت قریب ہو جائے تو تیاری کریگا۔ اور یہ تصور کرو کہ موت کے بعد مجھے غسل اور کفنایا جائے گا۔ اور یہ بھی تصور کیا جائے کہ مجھے پوری کائنات سے تعلق کاٹنا پڑے گا۔ بس اللہ تعالے اور میں ہوں گا۔ اور کچی پیشی قبر اور پکی پیشی آخرت میں ہو گی۔

حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ ظہر اور عصر کے درمیان مریدین کے خطوط سناتے تھے۔ خط والے کا نام نہیں بتاتے تھے تا کہ پردہ رہ جائے۔ اور جواب بھی سناتے تھے۔ ایک خط سنایا۔ لکھا تھا کہ حضرت نیند کیوجہ سے تہجد کی نماز ترک ہو جاتی ہے۔ جواب لکھا پھر کیا۔ کہ جب نیند میں ہو اور نیند کی وجہ سے تہجد ضائع ہوا تو پھر کیا۔ نقصان تو بیداری کی حالت میں ہوتا ہے۔ دوسرا خط سنایا کہ حضرت تہجد میں سستی ہوتی ہے۔ فرمایا چستی کرو کہ سستی کا علاج چستی ہے۔ چستی کر کے کھڑے ہو جاؤ اور تہجد پڑھو۔ ایک اور خط سنایا کہ میں شرعی نقطہ سے پوری طرح نماز ادا کرتا ہوں مگر بعد میں بھی خطرہ رہتا ہے کہ قبول ہو گی یا نہیں۔ جواب فرمایا یہ بحر معرفت کا قطرہ ہے کہ مؤمن عبادت کے بعد بھی ڈرتا ہے کہ شاید قبول ہو گی یا نہ ہو گی۔ ایک اور خط سنایا کہ ہمارے پڑوسی نماز نہیں پڑھتے۔

دیکھو تبلیغ حق ہے مگر تبلیغ کے بعد دوسروں کے غم میں نہ گھلتے رہو۔ تو جواب دیا کہ کار خود کن کار بیگانہ مکن۔ کہ قیامت کے دن تجھ سے تیرے اعمال پوچھیں گے نہ کہ دوسروں کے۔

(5) پانچواں اسباب فکر آخرت ہے۔ انسان پر ہر وقت فکرِ آخرت کا غلبہ ہونا چاہیئے۔ خاص کر بڑھاپے میں تو بہت ضروری ہے۔۔۔۔۔۔ کہ ایک صوفی بزرگ فرماتے ہیں کہ ویسے تو سانپ ٹیڑھا ہو کر چلتا ہے اور جب اپنے سوراخ میں داخل ہوتا ہے۔ تو سیدھا ہو جاتا ہے۔ تو کیا مومن جب قبر والے سوراخ میں داخل ہونیکے قریب ہو جائے تو کیا سیدھا نہ ہو جائے۔

اکبر الہ آبادی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ میں امت کی اصلاح کی ہے کیونکہ انگریزی خاں آدمی تھے۔ ہر معاملہ سے واقف تھے۔ تو خوب اصلاح کی۔ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ بھی ان کے ہاں ملنے کیلئے تشریف لے جاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہمارے زمانہ کے شیخ سعدی رحمتہ اللہ ہیں۔ انہیں ایک دوست ملنے آیا تو اسی چٹ کی پشت پر لکھدیا

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا
اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

بہرحال فکر آخرت بہت بڑی چیز ہے۔ سبحان اللہ پرانے زمانہ کے بےدین آج کے بادین سے اچھے ہوتے

تھے۔ اکبر بادشاہ بڑا برا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ اسے ایک رات نیند نہ آئی تو ہر درباری اس کوشش میں ہو کہ انہیں کسی طرح نیند آ جائے مگر نہیں۔ آخر ان سے پوچھا گیا کہ اتنے غمگین کیوں ہیں۔ کہا کہ آج تو سمر قند سے بخارا تک میں بادشاہ ہوں مگر کل میں ایک تنگ قبر میں جاؤنگا تو وہاں کیا حال ہو گا۔ کیا آج کل کے صدروں نے بھی کبھی قبر کی فکر کی ہے۔ اس سے اوپر مہر کیا ہو کہ عبثیات میں مشغول ہیں۔ اکبر کا وزیر بیربل ہندو تھا جو بہت دانا تھا اس نے ایک تدبیر بتلائی کہ آپ مسلمان ہیں اور آپ کا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم زمین میں زندہ ہیں اور آپ بھی مر کر زمین میں جائیں گے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی برکت کی روشنی آپ تک آجائیگی تو پھر اسے سکون آ گیا۔

(6) قلب پر مہر لگ جانے کا چھٹا سبب حب مال ہے۔ کہ مال کی حد سے زیادہ محبت بھی دل پر زنگ چڑھا دیتا ہے۔ سب لوگوں کو معلوم ہے کہ سود حرام ہے۔ تو مال کی محبت اس قدر غالب ہے کہ سود کو حرام جان کر بھی سودی کاروبار کرتے ہیں۔ اسی طرح رشوت والے کو اسکی حُرمت کا خوب پتہ ہے مگر مال کی محبت نے اندھا کر دیا ہے۔ معلوم ہو گیا کہ رزق حلال میں بہت برکتیں ہیں۔

(7) ساتواں سبب نفرت عن الوعظ کہ وعظ اور

نصیحت سے نفرت کرنا۔ یہ یقینی بات ہے کہ دل کو روشن کرنے والی چیز دین کی تبلیغ ہے۔ اب جو اللہ تعالے کی چیزوں کی تبلیغ سے نفرت کریں گے ان کے قلب کا میل بڑھتا رہے گا حتی کہ مہر لگ جائے گی۔ ابن سمعون رحمتہ اللہ بغداد کے واعظ تھے۔ انہوں نے بغداد میں وعظ شروع کیا تو مرد اور عورتیں دونوں علیحدہ علیحدہ شریک ہوتے تھے۔ عورت کو بھی نصیحت کی ضرورت ہے۔

الدنیا کلھا متاع و خیرہا امراۃ صالحتہ۔ کہ دنیا کا اچھا مال نیک عورتیں ہیں۔ تو ایک عورت جس کا گھر دریا دجلہ کے قریب تھا وہ درس سننے آتی تھی دورانِ درس ایک آدمی نے آکر کہا کہ دریا میں طغیانی آگئی ہے تم جا کر گھر کا سامان کہیں حفاظت کی جگہ لیجاؤ۔ تو حضرت بی بی رحمتہ اللہ نے یہ کام جو کیا میں یہ نہیں کہتا کہ غلط کیا یا درست۔ مگر اس کا دینی جذبہ بیان کرتا ہوں کہ اس نے کہا اگر پانی مکان بہا لے گیا تو اللہ تعالےٰ اور مال دے گا تو مکان بنا لونگی ورنہ اس رحمت سے جو سن رہی ہوں محروم ہو جاؤنگی۔

حضرت حنظلہؓ نے عرض کی یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب آپ وعظ فرماتے ہیں تو آنکھیں بہہ پڑتی ہیں۔ اور دل اللہ تعالے کے خوف سے کانپ اٹھتے ہیں۔ اور جب آپ قیامت کا ذکر فرماتے ہیں تو وہ ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ مگر جب ہم گھر جاتے ہیں تو یہ چیز ضائع ہو جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا اگر ہر وقت

وہی حالت قائم رہے تو تم سے فرشتے مصافحہ کریں۔

(8) آٹھویں چیز ذکر اللہ۔ قرآن نے ذکر کے بارہ میں بہت ہدایات دی ہیں۔ فاذکرونی اذکرکم۔ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ آج تو اتنی بات کوئی کمشنر بھی نہیں کہتا۔ ایک صحابیؓ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے کہ مجھ پر اسلام کے احکامات بہت بڑھ گئے ہیں۔ فامرنی بامرٍ۔ مجھے کوئی مختصر حکم فرمادو اعمل بہ میں اس پر عمل کروں آپ نے فرمایا لایزال لسانک رطبا من ذکر اللہ ہمیشہ تیری زبان اللہ تعالےٰ کی یاد سے تر ہونی چاہیئے۔ تو حدیث پاک ہے کہ جو آدمی مجھے آسودہ حالی میں یاد کرے میں اسے تکلیف کے وقت یاد کرونگا۔ یعنی اگر تین ہزار تنخواہ ہے تو بھی اللہ تعالےٰ کو یاد کرو اللہ تمہیں مصیبت میں یاد کرے گا۔ اگر تم اکڑے رہے تو پھر اللہ تعالےٰ مصیبت میں بھی یاد نہ کریگا۔ دوسری حدیث پاک ہے کہ جو مجھے تنھائی میں یاد کرے میں اسے تنھائی میں یاد کروں گا۔ اور جو مجھے جماعت میں یاد کرے میں اسے اس سے بہتر (فرشتوں والی) جماعت میں یاد کرونگا۔

(9) نویں چیز قرآن پاک کی تلاوت یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے قلب دھل جاتا ہے۔ جس طرح انسان روزانہ غسل کرتا ہے اسی طرح قرآن پاک کی تلاوت سے انسان کا قلب

روزانہ غسل حاصل کرتا ہے۔ قرآن کی تلاوت کے علاوہ ہر دوا کیلئے ایک پرہیز کی ضرورت ہے۔ جو آدمی یہ چاہے کہ میرا قلب نیکی کی طرف مائل ہو اس کے لئے اکلِ حلال بڑی ضروری چیز ہے۔ اکل حلال میں بڑی برکت ہے۔ تو بندہ کو اکلِ حلال کی کوشش کرنی چاہیئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ نے فرمایا حلال مال اچھی جگہ صرف ہوتا ہے۔ ایک شاگرد نے کہا اس کا مطلب سمجھ نہیں آیا۔ تو اپنی طرف سے ایک روپیہ دیا اور فرمایا مدرسہ کے باہر سب سے پہلے جو آدمی ملے اسے دیدینا۔ اگر یہ حلال کا ہے تو صحیح مصرف پر خرچ ہو گا۔ تو اسے باہر ایک گھوڑ سوار ملا اسے دیدیا گھوڑ سوار نے رومال میں بندھی کوئی چیز نیچے پھینک دی اور چلا گیا۔ کہ حلال مال کو بیجا صرف نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر یہ تو ایک گھوڑ سوار تھا کوئی غریب تو نہ تھا۔ آپ نے فرمایا جاؤ تحقیق کرو۔ باہر گیا تو وہ اتفاق سے مل گیا دریافت کیا۔ اس نے کہا میں اور میرے بچے کافی عرصہ سے بھوکے ہیں۔ تو ایک آدمی نے گھوڑا دیا ہے کہ اس پر بیٹھ کر فلاں شخص کے پاس جاؤ مگر اس سے بھی ملنے کی امید نہ تھی۔ تو راستے میں ایک مردار مرغی ملی جو اٹھالی ہے کہ اس سے گذارا کریں گے۔ مگر جب تم نے روپیہ دیا تو وہ میں نے پھینک دی۔ روس کا بادشاہ زار روس نے اسلام کا مطالعہ کیا تو متاثر ہوا علماء کو بلوایا پوچھا کیا میں اسلام لانے کے بعد شراب پی سکتا ہوں۔ جب یہ خبر حضرت مولانا

گنگوہی رحمتہ اللہ کو پہنچی تو کہنے لگے کہ اف مولویوں نے غلطی کی۔ میں تو کہتا کہ شراب پینا گناہ ہے اور عیسائیت ایک کفر ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ کفر سے ایمان میں آجاؤ۔

درس نمبر۱۴

21 اکتوبر 1966ء

تعریفِ نفاق

آج کے درس سے منافقوں کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ سورۃ بقرہ کا ارتباط بیان کرتا ہوں۔ اس میں تین قسم کے لوگوں کا بیان ہے۔ 1۔ جو دل اور زبان دونوں سے مسلمان ہوئے۔ ھدی للمتقین سے ھم المفلحون تک ان کا بیان ہے۔

2۔ دل اور زبان دونوں سے کافر ہیں۔ ان الذین کفروا سے ختم اللہ علی قلوبھم الخ تک ان کا بیان ہے۔

3۔ تیسرا گروہ وہ جو زبان سے مسلمان اور دل سے کافر ہے۔ اس کو منافق کہتے ہیں۔ نفاق اس میں رواج دینے کو کہتے ہیں۔ تو منافق بھی اپنے ایمان کو رواج دینا چاہتا ہے کہ میں لوگوں میں مؤمن شمار ہو جاؤں۔ تو قرآن پاک نے تین قسم کے انسان ذکر کئے آج منافقین کا بیان ہے۔

متقین کتنا بڑا گروہ ہے مگر قرآن نے ان کے بارے میں صرف چار آیتیں بیان کی ہیں اور کافروں کیلئے دو آیتیں

ذکر کیں۔ مگر اس سورۃ بقرہ میں منافقوں کیلئے تیرہ (13) آیتیں ذکر کیں۔ اور آخیر میں منافقوں کا بیان رکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملت اسلامیہ کے حق میں کافر سے منافق زیادہ ضرر پہنچاتا ہے۔ اور حافظ عمادالدین ابن کثیر رحمتہ اللہ کا قول ہے کہ چار سورتوں میں منافقوں کا ذکر ہے۔ 1۔ بقرہ، 2۔ توبہ، 3۔ نور، 4۔ منافقون۔ سورۃ توبہ میں تفصیل سے ذکر ہے۔ گویا مسلمانوں نے نفاق کے مسئلہ پر پورا غور نہیں کیا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ منافقین بد ترین کافر ہیں۔ اس لئے انہیں مفسرین نے اخبث کافر لکھا ہے۔ ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار جہنم میں بھی درجے ہیں۔ منافق سب سے زیادہ عذاب میں ہوں گے۔ میں نے ان چاروں سورتوں میں خصال المنافقین کی پڑتال کی۔ اور ضبط کی ہیں۔ نفاق نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ نفاق یا منافقت کی دو قسم ہیں۔ 1۔ اعتقادی نفاق

2۔ عملی نفاق۔

عقیدہ کی منافقت۔ میں نے جو کچھ بیان کیا وہ اعتقادی نفاق بیان کیا ہے۔ یعنی بد ترین کفر اعتقادی نفاق ہے۔

نفاق کی تعریف: اخفاء الکفر و اظہار الایمان۔ کہ دل میں کفر چھپانا اور زبان پر ایمان ظاہر کرنا۔ یہ گویا اعتقادی نفاق ہوا۔ دوسرا (2) عملی نفاق ہے کہ ظاہراً و باطناً ایمان ہے لیکن یعمل کا

عمال المنافقین۔ کہ اس کے اعمال منافقین سے ملتے جلتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کے شروع میں اعتقادی نفاق کا بیان ہے۔ ہمارے اکابرین نے لکھا ہے کہ حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کافر اور مسلمانوں کے علاوہ تیسری جماعت منافقوں کی بھی تھی۔ لیکن جب اسلام کو عروج ہوا تو وہ منافق ختم ہو گئے۔ لیکن اب پھر اس زمانہ میں منافق پیدا ہو گئے ہیں۔ اس قسم کا نفاق دو تعلیموں نے پیدا کیا۔ جب مسلمانوں کا مرکز بغداد رہا تو تین فلسفوں کا ترجمہ ہوا۔ ہندو، یونان اور رومی کے فلسفے ذکر کئے گئے۔ جب یہ فلسفے عروج پر ہوئے تو چونکہ ماحول اسلامی تھا اس لئے کہتے تو تھے کہ ہم مسلمان ہیں لیکن کافر تھے۔ ابن کثیر کی (تاریخ کامل) اور (ابن خلدون) کی تاریخ میں ذکر ہے کہ منصور نے یونان خط لکھا کہ یونانی فلسفہ کی کتب بھیجیں۔ تو شاہ روم نے تلاش کرایا تو معلوم ہوا کہ زمینی تہہ خانے میں پڑا ہے۔ یعنی دفن کر چکے تھے۔ تو اس نے وزراء سے مشورہ لیا۔ تو یہ طے پایا کہ ضرور بھیجو تاکہ مسلمانوں کو اسلام میں شکوک و شبہات پیدا ہوں اور اسلام کمزور ہو۔ لیکن امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ اور امام رازی رحمتہ اللہ نے ان فلسفی قوانین سے اسلامی نکتوں کو حل کر دکھایا۔ لیکن ان فلسفوں سے کچھ لوگ متاثر ہو کر کافر ہو گئے۔ بہرحال قرآن پاک اس اعتقادی نفاق کو ان آیات میں بیان کرتا ہے۔ اور اس نفاق کی حقیقت کفر سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ منافق پوشیدہ اور

کافر ی ظاہری دشمن ہے۔ کافر کے ہاں کفر ہے مگر دھوکہ نہیں اور منافق کے ہاں دھوکہ ہے۔ جس طرح مرزائی کافر ہونیکے باوجود اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے لوگ عیسائی کم ہوتے ہیں اور مرزائی زیادہ کیونکہ عیسائی اپنے آپکو مسلمان تو نہیں کہتے۔ منافق طبقہ نے ہی دین میں سارا نقصان کیا ہے۔ بنگال میں سراج الدولہ رحمتہ اللہ، جنوبی ہندوستان میں ٹیپو شہید رحمتہ اللہ اور دہلی میں بہادر شاہ رحمتہ اللہ کی سلطنتوں پر جب انگریز نے قبضہ کرنا چاہا تو سراج الدولہ کا رشتہ دار جعفر، اور ٹیپو کا رشتہ دار صادق اور بہادر شاہ کا رشتہ دار الٰہی بخش یہ لوگ منافقت کر کے انگریز سے مل گئے اور ہم نے شکست کھائی۔ بغداد کے برابر مسلمانوں کی کوئی حکومت نہ تھی۔ معتصم کے وزیر ابن علقمی نے منافقت کی وہ ہلاکو سے مل گیا۔ یہ ہلاکو خالص کافر تھا۔ تو بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ ایک دن میں دس لاکھ مسلمان کاٹے گئے۔ یہ خاندان حضرت عباس رضؓ کی اولاد تھی ان پر جو مظالم ہوئے انہیں بیان نہیں کر سکتا۔ یہ سب کچھ ابن علقمی کی وجہ سے ہوا۔ اب بھی نفاق کی کمی نہیں ہے اس لئے ذرا کھول کر بیان کرتا ہوں۔ تو پہلے لفظی ترجمہ کرتا ہوں۔ ومن الناس من یقول امنا۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت پر ایمان لائے۔ وما ھم بمومنین۔ وہ ہرگز مومن نہیں دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور مومنوں سے۔ لیکن وہ اپنے آپ سے دغا بازی

کرتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے اور ان کے دل میں مرض ہے۔ اللہ نے
جھوٹ کیوجہ سے وہ مرض بڑھا دیا ہے۔ اور جب انہیں کہا جاتا ہے
کہ ملک میں خرابی نہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو صلح پسند لوگ ہیں۔
جیسے آج کل اس چیز کو پسند کرتے ہیں کہ بامسلمان اللہ اللہ بابرہمن
رام رام۔ تو اللہ تعالے کہتے ہیں الا انہم ھم المفسدون کہ یہی لوگ فساد
کرنیوالے ہیں۔ لیکن یہ نہیں بوجھتے۔ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ
جیسا ایمان اور لوگ لائے ہیں ویسا ایمان لاؤ تو کہتے ہیں کہ بیوقوفوں
جیسا ایمان لائیں؟ خدا تعالے کہتے ہیں کہ سن لو کہ یہی لوگ ہی سب
سے زیادہ بیوقوف ہیں۔ اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں
کہ ہم نے ایمان لایا۔ اور جب اپنے شیطانوں سے اکیلے ہوتے ہیں۔
تو کہتے ہیں ہم تو آپ کے ساتھ ہیں۔ مسلمانوں سے تو ہم ہنسی
کرتے ہیں۔ اللہ تم سے ہنسی کریگا۔ اور انہیں مہلت دے گا۔ کہ وہ
سرکشی میں مبتلاء رہیں۔ اس قسم کے لوگوں نے ہدایت کے
بدلے میں گمراہی خریدی۔ ان کی سوداگری نفع بخش نہ ہو گی۔ اور وہ
سوداگری کا ڈھنگ نہیں جانتے۔ پہلی آیت میں نفاق کی حقیقت کا
بیان ہے۔ وہ یہ ہے کہ زباں سے ایمان کا دعوٰی ہو اور دل خالی ہو۔
تو نفاق یہ ہوا کہ دل میں اللہ کی باتوں کا یقین نہیں مگر زبان پر دعوٰی
ہے۔ اس سے ایک بڑا اصول مستنبط ہوا کہ اسلام میں نرا زبانی
دعوٰی میں کوئی قوت نہیں بلکہ قلب میں جگہ ہو۔ آج اسلام کا کفر

ہونا ٹکہ برابر ہے۔ کیونکہ آج ذرا سی کسی کے مزاج کے خلاف بات ہوئی تو بس اسے کافر بنا دیا۔ کفر کے فتویٰ لگانے میں ذرا سوچ لیا کرو۔ جو کافر ہو اس کو کافر کہو اور جو نہیں اسے نہ کہو کیونکہ اگر کافر کو کافر نہ کہا تو اسلام مٹ جائیگا۔ اور اگر مومن کو کافر کہا تو یہ بہت بڑا جرم ہے۔ صحیح مسلم شریف کی حدیث شریف ہے من قال لاخیہ کافر فقد باع بہ احدھما۔ تو یہ حکم فان کان کما قال والارجع الیہ الخ اگر وہ کافر نہیں تو یہ کفر اسی کہنے والے پر پڑے گا۔ اس لئے ایسے فتویٰ میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ غلطی اور بات ہے لیکن دیدہ دانستہ نہ ہو۔ اور یہ بات عقل بھی تسلیم کرتی ہے۔ کہ بے گناہ کو ڈاکو بتلایا جاوے اور جو واقع میں ڈاکو ہو اسے چھپایا جائے۔ تو دین تو دین تو ملک کا نظام بھی اسے ظلم عظیم کہیگا۔ تو اسی طرح جو کافر نہ ہو اسے کافر کہنا بڑا ظلم ہے۔ دیکھو جو مسلمان ہو اور پھر کافر ہو جائے وہ مرتد ہے اس کا نکاح ختم ہو گیا اور اس کی سزا موت ہے۔ اور جو ابتداء سے کافر ہو اسکی سزا نہیں۔ اور مرتد کو سزا بھی اسلامی حکومت دیگی کیونکہ یہ ان کے ذمہ ہے۔ اسلامی حکومت کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ تعالے کو اصلی حاکم مانتی ہو۔ تو اللہ کے قانون کو قانونِ مملکت ماننا پڑے گا اور یہی چیزیں تمام مملکت عالم میں دستور ہیں۔ فرض کر لو کہ اسلامی مملکت میں ایک شخص مسلمان تھا اور قلب و زبان سے وہ اسلامی قانون کا باغی نہ تھا اور جب اس نے ارتداد کا دعوی کیا

تو اس کا معنی یہ کہ جس قانون کا حامی تھا اب اس سے بغاوت کرتا ہے۔ اور اس وقت پوری مملکتوں میں حکومت سے بغاوت کرنیوالے کی سزاء سزاءِ موت ہے۔ البتہ وہ شخص مستثنٰی ہے جو شروع سے کافر ہو۔ کیونکہ وہ قانون الٰہی کو ملک کا قانون مانتا ہے۔ اور اسے اللہ کا قانون نہیں مانتا۔ تو یقینی بات ہے کہ یہ پہلے بھی مومن نہیں تھا بلکہ ملکی قانون کا تابع تھا اور اب بھی اسی طرح ہے۔ لیکن جو پہلے مومن تھا تو اب یہ مرتد ہونا وہ بغاوت کرتا ہے۔ تو اس لئے اس کی سزا سزائے موت رکھی گئی۔ تو منافق کے سلسلے میں قابل اعتراض بات یہ ہے کہ یہ منافق بہت برے تھے۔ ان کی منافقت کا علم ہونیکے باوجود حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے نہ جنگ لڑی اور نہ انہیں تکلیف دی۔ عبداللہ بن ابی منافقوں کا سردار تھا۔ جب یہ بات سورۃ منافقون میں آئی۔ تو اس نے کہا کہ ہم مدینہ کے اصل باشندے ہیں۔ یہ مسافر مدینہ میں کیا رہینگے۔ دیکھو یہ بھی ایک نفاق ہے۔ تو یہ بات حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو پہنچ گئی۔ تو اس کا بیٹا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ میں نے سنا ہے کہ میرے والد کی یہ بات آپ تک پہنچی ہے۔ اگر آپ کی خواہش اس کے قتل کی ہے تو یہ کام مجھ سے لیں۔ کیونکہ میں اللہ تعالے سے کہونگا کہ میں نے اسے دین کیوجہ سے مار ڈالا ہے۔ اگر کسی دوسرے نے قتل کیا تو میرے دل میں شفقت پدری ابھرے

اور میں اسے قتل کر دوں۔ مگر آپنے قتل کا حکم نہ دیا۔ جب عبداللہ بن ابی مرا تو آپ نے جنازہ پڑھا۔ حضرت عمرؓ کو جوش آیا مگر ادب کے دائرہ میں عرض کی کہ یہ تو منافق ہے۔ تو حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اس کیلئے اتنے تک دعا مانگوںگا جب تک مجھے اللہ تعالےٰ نہ روکے۔ حضرت فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں کہ یہ شانِ رحمتہ اللعلمینی تھی۔ عبداللہ نے کہا اگر آپ اپنا کرتہ دیں تو کفن کے طور پر استعمال کرنا شاید بخشش ہو جائے۔ اس پر آپ کی تھوک بھی ڈالی گئی۔ ان تستغفر لھم سبعین مرۃً فلن یغفر اللہ الخ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جب تک ایمان نہ ہو تو یہ تبرکات کچھ نہ کریں گے۔ علماء حیران ہیں کہ ان سب باتوں کے باوجود منافقوں سے جہاد کیوں نہ ہوا۔ آپ کی شان رحمتہ اللعلمینی بھی دیکھو کہ آپ ایک مرتبہ مال غنیمت تقسیم کر رہے تھے۔ تو یہ ایک خاص طریقہ سے تقسیم ہوتی ہے۔ تو اس میں ایک منافق کا حصہ تھا۔ اس کے خیال میں شاید یہ حصہ کم تھا۔ تو کہا کہ اعدل یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپنے فرمایا آسمان و زمین میں تباہی ہو۔ تو سیدنا فاروق اعظمؓ نے اس پر تلوار نکال لی کہ اسے قتل کر دوں۔ کیونکہ اب اس کا نفاق ظاہر ہو گیا ہے۔ مگر آپ نے فرمایا نہیں۔ کیونکہ یہ عام طور پر لوگوں میں میرا صحابی شمار ہوتا ہے۔ تو اس کے قتل سے لوگ غلط راستہ پکڑیں گے کہ محمد اپنے اصحاب کو بھی قتل کر دیتا ہے۔ تو لوگ اس

غلط افواہ سے میرے پاس نہیں آئینگے۔ اور نہ ہدایت پائیں گے۔ اس لئے ان منافقوں سے آپ نے جنگ و جہاد نہیں کیا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر ایک آدمی یہ کہے کہ مجھے کدو اس لئے ناپسند ہے کہ حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا۔ تو یہ بھی ایمان قائم نہ رہا۔ ایمان کا بڑا نازک معاملہ ہے خاصکر پیغمبر علیہم السلام کے معاملہ میں۔ الصارم المسلول علی شاتم الرسول حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بہتان باندھنے والے پر ننگی تلوار ہے۔ تو نفاق کے سلسلہ میں ایک طرف دنیا میں سب رعایت دیگئی ہے۔ کہ منافق کا مال و اولاد وغیرہ سب کچھ محفوظ ہیں۔ لیکن آگے چلکر آخرت میں ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار۔ کہ آخرت میں دردناک عذاب ہوگا۔ یہ اس لئے کہ اس نے زبان پر کلمہ پڑھا ہے تو اس کی بدولت دنیا میں رعایت ہے۔ لیکن قبر میں خالص نفاق والا معاملہ شروع ہوگا۔

نفاق کا مدمقابل اخلاص ہے۔ اگر آدمی خلوص سے زبان پر اللہ اللہ کرتا رہے اور قلب دنیا کے کاروبار میں لگا رہے تو اجر ملے گا۔ ع

بر زبان تسبیح و دردل گاؤخر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

یہ حضرت بہاؤالدین رحمتہ اللہ کا شعر ہے جو پوری

دنیا میں مشہور ہے۔ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ نے فرمایا ہے کہ لوگوں نے اسے غلط تحریر کر دیا ہے۔ شعر یوں ہے ع

بر زبان تسبیح و در دل گاؤ خر
این چنیں تسبیح ہم دارد اثر

تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جو اللہ اللہ بالکل نہ کریں۔ دوسرے وہ جو صرف اللہ اللہ کریں اور تیسرے وہ جو دنیا اور دین دونوں کے کام کریں۔ وما امروا الا لیعبدواللہ مخلصین لہ الدین۔ کہ اخلاص ہو۔ غالب رحمتہ اللہ نے مبالغہ کیا ہے کہ ایمان میں منافقت سے کفر میں اخلاص بہتر ہے۔ کیونکہ وہ پورے خلوص سے کفر پر قائم ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ کافر اگر بتخانہ میں مرے تو اسے کعبہ میں ڈالو کیونکہ اس میں منافقت نہ تھی بلکہ کفر پر اخلاص تھا۔ ع

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑھو برہمن کو

یہ ایک شاعرانہ تخیل ہے کوئی دینی مسئلہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام پیغمبران علیہم السلام کو اخلاص کی تعلیم دی گئی ہے۔

درس نمبر ۱۵
23 اکتوبر 1966ء

تاریخ و اسبابِ نفاق

اس سے پہلے درس میں نفاق کے متعلق حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ نے اپنی بے مثال تفسیر ابن کثیر میں نفاق کا یہ مفہوم بیان کیا کہ اخفاء الشر و اظہار الخیر۔ دل میں شر چھپانا اور زبان سے خیر ظاہر کرنا۔ نفاق کا یہ عام معنی ہے۔ پھر آگے اس کی تقسیم کی ہے کہ اگر وہ شر کفر ہو اور زبان سے ایمان کا اظہار کرے۔ اسے اعتقادی کفر کہتے ہیں۔ منافقوں کا کفر بد ترین کفر ہے۔ اور دوم یہ کہ دل میں گناہ ہو اور زبان سے نیکی کا اظہار کرے۔ اسے عملی نفاق کہتے ہیں۔ یہ ابن کثیر کہتے ہیں کہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اب چند چیزیں ترتیب وار بیان کرتا ہوں۔

(1) نفاق کی تاریخ۔ کہ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو نفاق کا اظہار ہوا اس کی تاریخ کیا ہے؟

(2) اسباب نفاق۔ کہ نفاق کیوں کرتے ہیں۔

(3) اضرارِ نفاق۔ کہ نفاق کے نقصانات کیا ہیں؟

ان تینوں کی تحقیق ہو گی لیکن حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ ساتویں ہجری کے مفسر ہیں وہ نفاق کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں منافق والمنافق فی زمننا زندیق کہ مسلمانوں کا ماحول ہے اس لئے ظاہری اسلام سے چمٹا ہے مگر قلب میں منافق ہے۔ زندیق کا معنی یہ ہے کہ اندرونی کافرانہ عقیدہ کو چھپا کر ایمان کا اظہار کرے۔

مثلاً دیکھو یہ کام کتنا مشکل ہے کہ آدمی کل مامورات بجا لائے اور منہیات و حرام سے بچے۔ یہ مشکل ہے نہ؟ لیکن اسے عمل کہتے ہیں۔ اگر اس میں کوتاہی ہو جائے تو ابدی جہنم نہ ہو گی۔ مگر اس کے مقابل عقیدہ کتنا آسان ہے کہ بس قلب اور کھوپڑی سے مان لو تو ابدی جنت ملے گی۔ تو دیکھو یہ عقیدہ کتنا آسان ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے کم چیز کی قیمت زیادہ رکھی۔ ان عقیدوں پر قبر تک قائم رہنے سے جنت ملتی ہے۔ تو عقیدہ کا نتیجہ عمل کے نتیجے سے بہت زیادہ رکھا ہے۔ حالانکہ عقیدہ عمل سے آسان چیز ہے۔ آج یورپ کی تہذیب نے اس عقیدہ کو بگاڑ ڈالا ہے۔ تو ابن کثیر نے نفاق کا معنی اخفاء الشر واظہار الخیر بیان کیا ہے۔ وہ شر اگر گناہ کا ہو تو وہ کفر عملی ہے اور گناہ کبیرہ ہے ورنہ کفر ہے۔

تاریخِ نفاق: ابن کثیر نے پہلی جلد میں لکھا ہے کہ حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مکہ شریف میں تیرہ برس زندگی

گذری جو پُرخار تھی۔ مصیبتوں والی زندگی تھی۔ آپ کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اس دوران بچے بھوک سے مرتے تھے۔ اور مکہ کی خطرناک گرمی میں گرم ریتوں پر لٹایا جاتا تھا وغیرہ۔ یہ سب کچھ ہوا مگر ایک فرد نے ایمان ترک نہ کیا۔ تو حضرت حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مکہ کی تیرہ برس کی سخت زندگی کے عرصہ میں ایک منافق بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی مکی سورتوں میں نفاق کا تذکرہ نہیں۔

اس کے بعد آپ نے مدینہ شریف ہجرت فرمائی اور مدینہ کی دس سالہ زندگی میں پہلے دو سال میں کوئی منافق نہ تھا۔ مخلص مومن اور مخلص کافر تھے۔ مذبذب اور دورنگی والا کوئی شخص نہ تھا۔ اوس اور خزرج یہ مدینہ کے قبیلے تھے اور باقی تین بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع یہ یہودی قبیلے بھی آباد تھے۔ اوس و خزرج عرب قبائل تھے اور باقی تین یہ بنی اسرائیل تھے۔ ان کا اصل ملک فلسطین تھا۔ یہاں کیوں آئے۔ وہ اس لئے کہ جب توراۃ کا مطالعہ کیا۔ تو اس میں حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کمالات کا ذکر تھا۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی ذکر تھا کہ آپ کا آخری ٹھکانہ مدینہ منورہ ہو گا۔ تو انہوں نے صرف ایمان لانے کیوجہ سے اپنا وطن چھوڑا اور وطن بھی ایسا جہاں ہزاروں نبی مدفون ہیں۔ تو حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کشش نے کھینچا۔ کہ کبھی تو آپ پیدا ہوں

گے۔ ہم نہ تو ہماری اولاد تو ایمان لائیگی۔ لیکن جب وہ مقصد سامنے آیا تو اولین دشمن بھی یہی بد قسمت لوگ بنے۔ یعنی بنو نضیر اور بنو قینقاع وغیرہ۔ حالانکہ آپ کی پیدائش مبارک سے پہلے یہی یہود جنگوں میں دعاء مانگتے تھے۔ کہ یااللہ آخری نبی کے صدقہ جنگ میں کامیابی دیدو وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاء ھم ماعرفوا کفروا بہ ۔

حضرت عبداللہؓ ابن سلام یہ یہودیوں کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے چند مسائل پوچھے جب آپ نے جواب دئے تو پھر وہ مسلمان ہوگئے۔ انہیں یہود کی خصلتوں کا پتہ تھا۔ عرض کی یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہود میں طعنہ زنی بہت مرض ہے۔ میں ایک کمرہ میں پوشیدہ ہوجاتا ہوں۔ میرے اسلام کے مشہور ہونے سے پہلے میرے بارے میں یہود سے پوچھیں۔ آپ نے یہود سے حضرت عبداللہؓ ابن سلام کے بارے میں پوچھا تو یہودیوں نے ان کی بہت تعریف کی۔ بس اسی دوران عبداللہؓ ابن سلام کمرہ سے ظاہر ہوئے اور پڑھا اشھد ان لاالٰہ الا اللہ و اشھد ان محمداعبدہ و رسولہ جو اس وقت آپ کی تعریف کر رہے تھے۔ وہ بدک اٹھے اسی مجلس میں ہی حضرت عبداللہ ابن سلام کی برائی بیان کرنا شروع کردی۔ حضرت عبداللہؓ ابن سلام نے کہا کہ سوال تو میں نے رسماً کئے تھے ورنہ آپ کے چہرہ مبارک سے تو

صداقت ٹپک رہی تھی۔ حضرت عبداللہؓ ابن سلام فرماتے ہیں کہ چہرہ دیکھتے ہی میں نے کہدیا کہ یہ چہرہ جھوٹ بولنے والا نہیں۔ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود۔ کہ اللہ والوں کے چہرہ میں سجدوں کا نور ہوتا ہے۔ دیکھو ایمان پڑا تو دل میں ہے لیکن انوار چہرہ پر ہونگے۔ ذالک مثلھم فی التوراۃ و مثلھم فی الانجیل۔ لو امن بہ عشر من الیہود لا من کلھم۔ حدیث پاک میں ہے کہ اگر یہود کے دس علماء ایمان لے آتے تو سارے یہودی ایمان لے آتے۔ سب مسلمان ہو جاتے۔ لیکن صرف ایک عالم نے ایمان قبول کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہودی علماء اسلام نہیں لائے۔ تو کیوں نہ اسلام لائے؟

حالانکہ اپنا وطن فلسطین بھی صرف ایمان لانے کیلئے چھوڑا۔ وجہ یہ ہے کہ یہود کے علماء اپنے علاقہ کے پیر ہوا کرتے تھے۔ اور لوگوں سے بہت زیادہ رقمیں کماتے تھے۔ کما یعرفون ابناءھم۔ کہ یہود کے علماء نبی کو اس طرح جانتے پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو جانتے پہچانتے ہیں۔ تو ان علماؤں نے سوچا کہ ہیں تو وہی نبی مگر اگر ہم ان کے مرید ہو گئے تو یہ آمدنی ختم ہو جائے گی۔ تو اس وجہ سے یہ مخالف رہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مولوی پیر ہو تو اسے ایک پیسہ بھی نہ دو۔ بہر حال یہ یہود کافر ہو گئے اور جنگ بدر تک تو ٹھیک کافر رہے۔ لیکن جنگ بدر کے بعد انہیں یہ معلوم

ہو گیا کہ اگر ہم ظاہراً کافر رہے تو ہمارا حال بھی قریش مکہ کی طرح ہو گا۔ تو انہوں نے یہ سوچا کہ دل میں کفر اور زبان سے ایمان کا اظہار کریں۔ کیونکہ مسلمانوں میں شمار ہو کر جان و مال کی حفاظت رہیگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ مسلمانوں سے ڈر گئے تھے۔ اس صورت سے (2ھ) دو ہجری سے نفاق شروع ہوا۔

حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مہاجرین میں ایک شخص بھی کسی زمانہ میں منافق نہیں گذرا۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں مجھے تنہائی میں بلا کر پوچھا کہ تمہیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جن منافقین کے نام بتائے تھے کیا میرا نام تو ان میں نہیں۔ یہ تقویٰ کا کمال ہے اور کمال کی دیانت ہے۔ ایک انگریز نے صحیح بات کہی ہے کہ مسلمانوں میں ایک بیوقوف طبقہ ہے۔ جو اس شخص کو بھی مسلمان نہیں مانتے جس نے پوری مسلمان دنیا کو فتح کیا ہے۔ ابو جہل کا نام بھی عمر اور آپ کا نام بھی عمرؓ تھا۔ تو حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دعاء کی کہ یا اللہ ان میں سے کسی کو مسلمان کرو۔ تو علماء لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو تو خود نبی پاک صلے اللہ علیہ وسلم نے مانگا ہے۔

حضرت عبداللہ ابنؓ مسعود فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد ایمان روزانہ ترقی کر رہا تھا۔ ہر ایک

نے پوشیدہ ہجرت کی۔ مگر حضرت عمرؓ نے اونٹ پر سوار ہو کر کفار مکہ کو اعلان کیا کہ آج عمرؓ مدینہ کو ہجرت کر رہا ہے جس نے بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم بنانا ہو وہ آئے عمرؓ جا رہا ہے۔ ابوجہل آیا۔ مگر حضرت عمرؓ نے فرمایا بنی عدی قوم کا کون مقابلہ کرے گا۔ بس اس بات نے کفار کو ٹھنڈا کیا۔ پھر کوئی کافر بھی آپ کے قریب نہ آیا۔ سیدنا حضرت حمزہؓ ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے۔ ہرن کے شکار کو گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر عورتوں نے بتایا کہ آج تو ابوجہل نے تیرے بھتیجے کی بڑی ہتک کی ہے۔ آپ گھر نہ گئے وہیں سے سیدھے کعبہ شریف میں گئے جہاں ابوجہل اپنے پورے حلقے اور قوم کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آپ نے پوری قوت سے کمان اس کے سر میں ماری اور کہا کہ میں اس کے دین پر ہوں۔ آؤ میرا جو کچھ کرنا ہو کر لو۔ اس کے بعد اپنے بھتیجے کے پاس آئے کہا بھتیجے تیرا انتقام لے آیا ہوں۔

آپ نے فرمایا چچا مجھے تب خوشی ہو گی جب آپ ایمان لائیں گے۔ خیر کچھ عرصہ بعد آپ مسلمان ہو گیے۔ عبداللہ ابن ابی یہ منافقوں کے خزرج قبیلے کا سردار ہے۔ مدینہ میں اس کیلئے بادشاہی کا اعلان ہونیوالا تھا۔ جس کیلئے ایک تاج بھی بنوا لیا گیا تھا۔ بس شاہی جشن عنقریب تیار تھا۔ اتنے میں حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ تو جو تاجپوشی کرنیوالے تھے وہ مسلمان ہو

گئے اور شاہی کا معاملہ وہیں رہ گیا۔ تو اس وجہ سے عبداللہ بن ابی دین کا دشمن ہو گیا۔ ظاہری دشمن بننے کی جرأت نہ کی بلکہ نفاق اختیار کیا۔ عبداللہ بن ابی جب مرا تو مدینہ سے نفاق بھی ختم ہو گیا۔

اسبابِ نفاق: کہ آدمی منافق کیوں بنتا ہے۔ یعنی وہ کیا چیزیں ہیں جو منافق بناتی ہیں۔

(1) خوفِ مخلوق اور خالق سے بیخوفی۔ یعنی خالق سے نہ ڈرے۔ ایسا آدمی منافق بنتا ہے۔ اگر آدمی خالق سے ڈرے کہ وہ میری ہر پوشیدہ سے پوشیدہ بات جانتا ہے تو کیسے منافق ہو گا۔ بس انسان صرف مخلوق کے ڈر سے منافق بنتا ہے۔ تو خوف مخلوق منافق ہونے کا بہت بڑا سبب ہوا۔ اب ہر شخص دیکھے کہ میرے قلب میں خالق کا خوف ہے یا مخلوق کا۔ بس اس سے اپنے ایمان کو ماپ لے کیونکہ اس سے نفاق کی حدِ فاصل متعین ہوتی ہے۔ حضرات صحابہؓ کرام کا یہ حال تھا کہ ان پر خالق کا خوف غالب تھا اگر نہ ہوتا تو کیا وہ مکہ کی مشکل ترین زندگی میں نفاق نہ کر سکتے تھے۔ لیکن وہ نفاق نہ لائے اور مر مٹے۔

(2) دوسرا سبب حب جاہ و شہرت۔ کہ آدمی یہ چاہے کہ لوگوں میں میری شہرت و عزت ہو یہ بھی منافقت ہے۔ اور اگر نفاق کا زمانہ دیکھو تو ووٹوں کا زمانہ دیکھو۔ تقریریں کتنی عمدہ کرتے ہیں مگر جب ممبر بن جائیں تو بات تک نہیں سنتے۔ تو

مطلب یہ کہ عزت و شہرت قائم رکھنے کیلئے دل کے خلاف زبان پر باتیں لاتا ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مرید تھے۔ حضرت حاجی مہاجر مکی رحمتہ اللہ آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو لوگ مرید ہونیکے لئے وہیں مکہ شریف جاتے۔ بہت سے لوگ جانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ تو ایسے لوگوں نے عرض کی کہ حضرت اگر ہندوستان میں آپ کا کوئی خلیفہ ہو تو ہمیں حکم فرما دیویں ہم ان کے مرید ہو جاویں۔ تو حضرت حاجی مہاجر مکی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا خلیفہ تو بہت ہیں ذرا ان کا حال تو معلوم کر لوں۔ تو آپ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ کو لکھا کہ آپ کو خلیفہ بنا دوں؟ لوگوں کو اللہ اللہ سکھلا دو گے تو حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ نے جواب لکھا کہ میں تو نااہل ہوں کسی اہل کو سپرد کریں۔ تو حضرت حاجی مہاجر مکی رحمتہ اللہ نے دوبارہ لکھا کہ میں ایک بات پوچھتا ہوں اس کا صحیح جواب دینا۔ (کہ آپ پر مخلوقِ خدا کا کیا اثر ہے) تو آپ نے جواب دیا اور تو کچھ نہیں صرف اتنا ہے کہ پوری مخلوق اگر میری تعریف کرے تو مجھے خوشی نہیں ہوتی۔ اور اگر تذلیل کرے تو مجھے غصہ نہیں آتا۔ تو اس پر حضرت حاجی مہاجر مکی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم واقعی خلافت کے قابل ہو۔

درس نمبر ۱۶

28 اکتوبر 1966ء

نقصاناتِ نفاق

ان تیرہ آیتوں میں اللہ تعالے منافقین کا حال بیان کرتا ہے۔ پہلی آیت ومن الناس من یقول امنا باللہ ۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم خدا تعالے پر ایمان لائے ہیں لیکن وہ واقع میں مومن نہیں۔ اس سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔ کہ ایمان کا صرف دعویٰ کافی نہیں جب تک کہ حقیقت نہ ہو۔ دیکھو منافق بھی صاف صاف ایمان کا دعویٰ کرتے تھے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے فرمایا وما ھم بمومنین تو زبانی دعویٰ کے علاوہ حقیقت ہونی چاہیے یہ صرف شریعت کا قانون نہیں۔ بلکہ ہر حکومت کا یہ قانون ہے کہ دنیا کی کسی عدالت میں دعویٰ پر ڈگری نہیں ہوتی تاوقتیکہ اس دعوی کا ثبوت نہ ہو۔ تو اسی طرح اللہ تعالےٰ کے ہاں بھی ثبوت ہو تو تب ایمان ہے۔ دوسرا سبق یہ کہ ظاہراً اور باطناً دل اور زبان کی مخالفت بہت کچھ ہے۔ کہ زبان سے تو ایمان کا دعویٰ کیا اور دل میں مخالف ہے۔ قرآن اس صفت کو پہلے لایا۔ تو اس سے معلوم ہو گیا کہ زبان پر کچھ

اور دل میں کچھ اور ہو تو یہ صفت خدا تعالےٰ کو ناپسند ہے۔
منافق اسلامی طاقت کے آگے دبے ہوئے ہیں۔
دل میں کوئی طاقت نہیں بزدل ہیں۔ قلب اور زبان کے اختلاف میں ایک نقص تو یہ ہے کہ قانونِ فطرت کو توڑنا ہے۔ کیونکہ انسان کو اللہ تعالےٰ نے قوت گویائی سے ہر جاندار پر فوقیت بخشی ہے کہ قلب میں جو کچھ ہو اسے زبان سے بیان کرو۔ حیوانات کو یہ طاقت نہیں دیگئی۔ الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان کہ رحمٰن نے قرآن سکھایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سب سے بڑی تعلیم قرآن کی تعلیم ہے۔ اور انسان کو پیدا کیا اور اسے بات کہنا سکھایا۔ یعنی قوت گویائی بخشی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کے بعد دوسرا نمبر قوتِ گویائی کا ہے۔ تو بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ پہلے قرآن کا لفظ ہے اور بعد میں ساتھ ہی ساتھ بیان کا لفظ فرمایا۔ یعنی علمہ البیان۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ قوتِ بیان اصل میں قرآن پاک کی تلاوت کرنے کیلئے ہے۔ باقی مقصد تو فروعی ہیں۔ جانوروں کے قلب میں جو کچھ گذرتا ہے وہ بول نہیں سکتے ماسوا انسان کے۔ تو اس کی کیا حکمت ہوئی؟ کیونکہ اللہ تعالےٰ کی تخلیق میں خاص حکمت ہوا کرتی ہے۔

(1) پہلی حکمت تو یہ کہ جانوروں اور حیوانات پر اللہ کی طرف سے نہ کوئی کتاب اور نہ کوئی پیغمبر علیہم السلام آیا ہے۔

بخلاف انسان کے۔ کہ اسکی ھدایت کیلئے پیغمبر علیہم السلام اور کتابیں بھیجیں۔ اور قرآن و حدیث دونوں زبان سے ادا ہوتی ہیں۔ پہلے پیغمبر علیہ السلام کو کتاب ملے گی۔ وہ پھر لوگوں کو سکھائیں گے۔ اس طرح قیامت تک قرآن و حدیث سکھاتے چلے جائیں گے۔

تو اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ دین کی بقاء قوت گویائی پر منحصر ہے۔ تو اس لئے انسان کو قوت گویائی بخشی۔ بظاہر تو انسان کیلئے بطور دنیا بھی قوت گویائی کا ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ انسان کی دنیا اجتماعی اور حیوان کی دنیا انفرادی ہے۔ حیوان اگر تن تنہا ہو تو وہ اپنی زندگی گزار سکتا ہے۔ لیکن انسان نہیں گزار سکتا۔ کیونکہ اس کی دنیا اجتماعی زندگی ہے۔ انسان کو سب سے پہلے کپڑے کی ضرورت ہے۔ مگر کسی جانور کو کوٹ پتلون وغیرہ کسی کپڑے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال جانوروں کیلئے کھانا۔ پینا قدرتی ہوئے۔ اور انسان کیلئے سب سے پہلے کپڑے کی ضرورت ہے۔ تو خریدتے وقت قیمت کا تعین اور کپڑے کی خصوصیت اور بعد میں درزی کے پاس بھی قوت گویائی کی ضرورت ہو گی۔ تو اتنی محتاجی تو صرف پوشاک کی چیزوں میں ہے۔ علی ھذا القیاس۔ کھانے پینے کی اشیاء اور دنیا کے ہر کاروبار میں قوت گویائی کی ضرورت ہے۔ تو سب چیزیں قوت گویائی پر منحصر ہوئیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ

انسان تنہا نہیں رہ سکتا اور اسے اجتماعی زندگی میں تبادلہ خیال کیلئے قوت گویائی کی ضرورت ہے۔ اب جو قوت گویائی عطاء ہوئی اور اسے سورۃ الرحمٰن میں ذکر کیا گیا۔ یہ قوت کیوں عطا ہوئی۔ وہ حکمت یہ کہ جو کچھ قلب میں ہو اسے زبان سے ظاہر کرے۔ مثلاً قلب میں چائے خریدنی ہے تو زبان سے بھی چائے مانگے۔ دل میں لٹھا خریدنا ہو اور زبان سے کھدر مانگو تو یہ غلط بات ہے۔ اسے منافقت کہتے ہیں۔ اگر دل میں قرآن کا علم سیکھنا ہے تو زبان سے بھی قرآن کا علم ادا کرو۔

جو دل میں کچھ اور زبان پر کچھ رکھتا ہو وہ منافقت کرے گا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بے جا صرف کیا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے زبان دل کے اظہار کیلئے دی ہے۔ لیکن منافق اس کا الٹ کرتا ہے۔ (1) تو اس سے بڑا نقصان یہ کہ نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ (2) دوم نقصان یہ کہ انسانوں کی باہمی تنظیم قول و اقرار و اعتماد پر ہے اور اعتماد کی بنیاد زبان ہے۔ یعنی زبان سے جو الفاظ ادا کئے جائیں انہی سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں میرا دوست اور فلاں میرا دشمن ہے۔ عبداللہ بن ابی بہت بڑا منافق تھا اب اس سے عالمی سیاست نفاق بن گئی۔ دیکھو امریکہ اگر کوئی اچھی بات کہتا ہے تو روس کو اعتماد نہیں وغیرہ۔ جب قول و اقرار پر اعتماد نہ رہا تو قوت گویائی کا مقصد حل نہ ہوا۔ زبان اور قلم ناقابل اعتماد رہے۔

اب اس کا علاج ہے کہ قیامت قائم ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کی تھوڑی اور چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی کتنی حکمتیں رکھتی ہیں۔ اگر سچ ہوتا تو پوری دنیا آرام و سکون میں ہوتی۔ تو نفاق سے تنظیم بشری تباہ و برباد ہوئی۔

(3) نفاق سے اخلاص کا خاتمہ ہو جاتا ہے: تیسری چیز یہ کہ نفاق سے اخلاص کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فقرہ ہے۔ کسی نے آپ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق پوچھا کہ عمر رضی اللہ عنہ کیسے ہیں؟ "فرمایا عمر رضی اللہ عنہ کا معاملہ باہر سے اندر زیادہ اچھا ہے"۔ اسے اخلاص کہتے ہیں۔ اخلاص کا تعلق اللہ سے اور نفاق کا تعلق شیطان سے ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ باقی ہے اس سے جو تعلق ہو گا وہ باقی رہیگا۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ بخاریٰ سے مصر پیدل گئے معلوم ہوا کہ وہاں ایک بزرگ کے پاس ایک حدیث مبارک ہے۔ وہاں پہنچے دیکھا وہ بزرگ اپنے بھاگے ہوئے گھوڑے کو خالی گود دکھا کر پکڑ رہے ہیں۔ بس بغیر حدیث لئے واپس آ گئے کہ اس شخص نے گھوڑے سے دھوکہ کیا ہے۔ میں اس سے حدیث نہیں لیتا۔ حالانکہ وہ بزرگ کبار اولیاء میں سے تھے۔ مگر خلوص کا زمانہ تھا اس لئے علماء حدیث کے وصول کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ یہی چیز اخلاص ہے۔ اخلاص کی چیزیں پائیدار ہوتی ہیں۔ کیا دنیا میں کسی منافق کا نام زندہ ہے؟ مگر صحابہ کرام کا اسم گرامی بلند

ہے۔ تو معلوم ہو گیا کہ نفاق کو بربادی ہے۔ جب مغل دور میں
عرب سیاح دہلی آئے تو لکھتے ہیں کہ فیہا الف مدرسۃ۔ واحد للشافعی
والباقی الحنفیہ۔ کہ ہزار دینی مدارس ہیں ایک شافعیوں کا باقی سب
حنفیوں کے تھے۔ انگریز خبیث نے آکر ان سب کو ختم کیا۔ آج
کل میں اس پر کچھ لکھ رہا ہوں اگر چھپ گیا تو معلوم ہو جائیگا کہ دہلی
میں اسلامی عہد تک ایک ہزار مدارس قائم رہے اور 1857ء کے بعد
صرف ایک فتح پوری مدرسہ قائم ہے۔ جسے صرف مولویوں نے
سنبھال رکھا ہے۔ 1857ء میں انگریزوں نے مسلمانوں کی تعلیم کو
کمزور کرنا چاہا تو اوقاف پر قبضہ کیا اور نیلام کر دیا۔ پھر دفتری زبان
فارسی تھی اسے ختم کر کے مولوی کو ملازمت سے ختم کیا اور کوئی
شہید کر دئے گئے۔ تقریباً سات ہزار علماء شہید کر دئے گئے۔

دہلی کے خونی دروازہ پر علماء کو پھانسی دیگئی۔ جب
عالم کو پھانسی دی جاتی تو انگریزوں کی عورتیں تالیاں بجاتیں اور ہنستی
تھیں۔ بعض علماء کو تو زندہ خنزیر کی کھال میں بند کر کے آگ میں
ڈالا گیا۔ پھر کہتے کیا اب بھی اللہ کا نام لو گے؟ اندر سے آواز آتی
ہاں لیں گے۔ اللہ اکبر۔ جہان مولوی کے دل سے زندہ ہے۔ اسے
ذلیل نہ سمجھو۔ تو پہلے اوقاف کو چھینا پھر مسلمانوں کی زمینداری
ہندؤں کو ٹھیکے پر دی۔ علماؤں کے اوقاف سب کے سب نیلام کر
دئے گئے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی جزائر انڈیمان میں ختم

ہوئے۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمتہ اللہ مکہ تشریف لے گئے۔ مولانا محمد قاسم رحمتہ اللہ علیہ ہاتھ نہ آئے اور حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ باوجود گرفتار کرنے کے بچ گئے۔ ان حضرات نے سوچا کہ سب کچھ گیا مگر دین تو نہ جائے۔ تو دیوبند میں ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا۔ یہ ٹکڑا بھی ہندوؤں کا تھا۔ جہانگیر بادشاہ نے حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ کو مدرسہ دیوبند کی تعمیر سے کئی سو سال پہلے بلایا۔ گھوڑوں پر سفر تھا جب اس جگہ پر پہنچے تو اتر پڑے مٹی اٹھا کر سونگھی لوگوں کے پوچھنے پر فرمایا کہ اس مٹی سے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی حدیث کی خوشبو آرہی ہے۔ شاہ رفیع الدین رحمتہ اللہ علیہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص چابیاں دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ یہ دین کی چابیاں ہیں۔ اس کے بعد مولانا قاسم رحمتہ اللہ علیہ نے خواب دیکھا کہ میں کعبہ شریف کی چھت پر کھڑا ہوں اور میری طرف سے پوری جانب نورانی تاریں جارہی ہیں تو تین پیشین گوئیاں ہوئیں۔

1867ء میں مدرسہ قائم ہوا اور اس کے بنیادی اصول مقرر ہوئے۔ جو وصایا قاسمی کے نام سے چھپے ہوئے ہیں۔

(1) کہ اسلامی حکومت ہو یا غیر اسلامی کسی کی امداد نہ لی جائے۔

(2) جو امراء نام کی شہرت چاہیں ان سے چندہ نہ لیا جائے۔

(3) سوم یہ کہ مستقل آمدنی مثلاً زمین، مکان یا دکانیں وغیرہ نہ بنائی جائیں۔ کوئی اوقاف نہ بنایا جائے تا کہ اللہ سے مانگتے رہیں۔

اب آپ لوگ خیال کریں کہ ایسے اصولوں والا مدرسہ کیسے چلے گا؟ مگر ایک سو سال سے زائد عرصہ گذر چکا ہے۔ کتنے انقلاب آئے۔ اور مدرسہ بھی بستی میں کوئی شہری صورت بھی نہیں۔ مگر مدرسہ بفضلِ خداوند تعالےٰ قائم ہے۔ اس کی وجہ صرف اخلاص ہے۔ اور اخلاص کو اللہ سے تعلق ہے اس لئے باقی ہے۔ چوتھی صدی میں بغداد میں ایک مدرسہ تعمیر ہوا جس میں طلباء بھی اسی علاقہ کے رہنے والے تھے کوئی باہر سے نہ آئے تھے مگر وہ مدرسہ باقی نہ رہا۔ لیکن جس دن سے دیوبند کا مدرسہ تعمیر ہوا ہے اب تک دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جس کے طلباء وہاں سے تعلیم نہ حاصل کرتے ہوں۔ انہیں کوئی کھینچ کر نہیں لایا۔ مدرسہ کا نہ کوئی اخبار ہے اور نہ کوئی رسالہ۔ بس صرف ایک اخلاص کی کشش ہے۔ جب میں دیوبند میں پڑھاتا تھا تورات کو ایک طالبعلم آیا کہا کہ اجازت دو میں آپکے پاؤں دبانا چاہتا ہوں۔ اس سے پوچھا کہ کہاں کے رہنے والے ہو۔ کہنے لگا میں کاشغر کا رہنے والا ہوں۔ کہنے لگا ہمارے ہاں کا ایک تاجر دہلی آیا۔ واپسی پر اس نے دہلی کی باتیں سنائیں۔ تو لوگوں نے کہا میاں دہلی کہاں ہے اس نے کہا کہ دہلی دیوبند کے

قریب ہے۔ تو ہمارے ہاں دہلی دیوبند کے نام سے مشہور ہے۔ ذویمر نامی پادری کو مجبور ہو کر یہ کہنا پڑا کہ دیوبند اور سہارنپور میں اسلام کے پہلوان پیدا ہوتے ہیں۔ مگر آج مسلمان ان عربی مدارس کو تحقیر سے دیکھتے ہیں۔ ذویمر پادری کافر ہے۔ اس کا اقرار ہے کہ ان مدرسوں میں اسلام کے پہلوان پیدا ہوتے ہیں۔ ہم مانیں یا نہ مانیں۔ قدم قدم پر عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔ مگر خدا تعالے نے اخلاص کیوجہ سے اس ادارے کو خوب ترقی دی ہے۔

دیوبند میں ہمیشہ اسلامی تاریخ کی یکم کو تنخواہ ملتی ہے۔ مہتمم صاحب نے دعوت دی فرمانے لگے ہمارے بزرگوں کی تعلیم تھی کہ اگر مال کی کمی آجائے تو اللہ سے مانگو نہ کہ لوگوں سے۔ ساتھ ہی ایک اور صاحب چائے پی رہے تھے۔ وہ بریلوی خیال کے تھے۔ وہ کہنے لگے مجھے ٹی۔ بی کی بیماری ہے میں ڈیرہ دون گیا وہاں خواب میں ایک شخص نے کہا تم جو رقم علاج پر خرچ کرنا چاہتے ہو وہ اللہ تعالےٰ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے مہمانوں کو دیدو تمہیں صحت ہو جائیگی۔ تو اس دن سے مجھے صحت ہو گئی ہے۔ میرا اندازہ 35 ہزار رقم کے خرچے کا تھا وہ میں آپ کو پیش کرتا ہوں۔ مہتمم صاحب نے کہا مجھے بھی اتنی ہی رقم کی ضرورت تھی۔

آج کل ہندوؤں کا جو صدر ہے راجہ نامی اس نے بڑی عاجزی سے پیشکش کی کہ حکومتِ ہند مدرسہ کو امداد دینا چاہتی

ہے۔ مہتمم صاحب نے انکار کر دیا ہے۔ یہ صرف اخلاص کی دلیل ہے۔ کیونکہ اخلاص میں برکت ہے اور نفاق میں بے برکتی ہے۔

(4) نفاق میں چوتھی خرابی بزدلی ہے۔ کہ انسان کی بہترین خصلت شجاعت اور بہادری ہے۔ اور بدترین خصلت جُبن اور بزدلی ہے آخر آدمی منافق کیوں بنتا ہے۔ دوسرے شخص کے سامنے دل کی بات کیوں نہیں کہتا۔ دوسرے سے دب کر بات کرتا ہے اور دبنا تو بزدلی کی خسیس خصلت پیدا کرتا ہے۔

محمد تغلق جو خونی بادشاہ مشہور تھا۔ جسے وہ بلاتا تھا تو وہ شخص گھر وصیت کر کے جاتا تھا کہ شاید زندہ واپس نہ لوٹوں اس نے ایک مرتبہ مولانا عماد غوری رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا۔ کہا کہ تاریخ میں لکھا کہ "نبوت فیضِ خدا است"۔ نبوت تو فیض خدا ہے اسے بند کیوں کیا جارہا ہے۔ دیکھو بادشاہ نے کوئی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا بس اتنا ظاہر کیا کہ نبوت کا دعویٰ جاری رہے۔ اس وقت تو غیرتِ ایمانی تھی جواب دیا کہ دیکھو میاں علم اور تعلق مع اللہ بہت بڑی نعمت ہے۔ عالم کہتے ہیں کہ "گو مخور چہ مے گوئی" کہ پاخانہ مت کھاؤ کیا بکتے ہو۔ حکم ملا کہ اسے ذبح کر دو اور زبان کاٹ کر نکال لو۔ اس پر عمل کیا گیا۔ جب مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے گلے پر چھری رکھی گئی تو کلمہ شہادت پڑھا۔ یہ صرف اخلاص تھا ورنہ اگر مولانا خاموش رہتے تو جان نہ جاتی۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے خاموشی کو نفاق سمجھا کہ دل

کی بات کو ظاہر نہ کرے۔ آج کل بعض لوگ دین کے خلاف باتیں سن کر رواداری رکھتے ہیں۔

1 اس درس میں نفاق کے چار نقصان بیان کیے گئے۔

1۔ نظام درہم برہم ہو جاتا ہے،

2۔ اعتماد ختم،

3۔ تنظیم بشری ختم،

4۔ شجاعت ختم ہو جاتی ہے۔

درس نمبر ۱۷
4 نومبر 1966ء

مُنافق دھوکہ دیتا ہے

اس سے پہلے درس میں منافقوں کی ایک خصلت ظاہری اور باطنی کا بیان تھا۔ اب دوسری خصلت کا بیان ہے۔ کہ منافق اللہ کو اور مومنوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ وما یشعرون مگر وہ خود اپنے نفسوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور جانتے نہیں۔ اللہ تعالےٰ کو منافق سخت ناپسند ہے۔ آج ان گذشتہ دو دھوکوں میں بہت ترقی ہے۔ اللہ تعالےٰ کو تو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ کیونکہ دھوکہ یہ ہے کہ اظہار خیر ہو اور اخفاء شر ہو۔ مثلاً دھوکہ باز کسی کو پھسلائے تو سبز باغ دکھا کر دل میں ضرر پہنچاتا ہے۔ اسے دھوکہ کہتے ہیں۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ مؤمنوں کو دھوکہ دینا تو ایک حد تک درست ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ جو عالم الغیب والشھادۃ ہے اس کو کون دھوکہ دے سکتا ہے۔ واللہ یعلم خائنۃ الاعین۔ وما تخفی الصدور۔ کہ اللہ تعالےٰ آنکھ کی خیانت کو جانتا ہے۔ کہ جو آنکھ خیانت کر کے کسی غیر محرم کو دیکھے۔ اور دل کی

بات کو بھی خدا تعالےٰ جانتا ہے۔ تو منافقین پھر کیسے دھوکہ دے سکتے ہیں۔

دھوکہ کی دو قسمیں ہیں۔ (1) اعتقادی دھوکہ۔ (2) عملی دھوکہ

اعتقادی دھوکہ۔ آدمی یہ سمجھے میں جو دھوکہ دے رہا ہوں۔ میری وہ چھپی ہوئی چیز اس آدمی سے پوشیدہ ہے۔ اسے اس چیز کا پتہ نہیں۔ اس قسم کا دھوکہ مؤمنوں سے ہو سکتا ہے اللہ تعالےٰ سے نہیں۔ اللہ تعالےٰ سے عملی دھوکہ تو ہو سکتا ہے مگر اعتقادی دھوکہ نہیں ہو سکتا۔

عملی دھوکہ۔ مثلاً دھوکہ اکثر معاملات میں ہوتا ہے۔ آپ یاد رکھیں کہ دین کا معاملہ صرف اللہ تعالےٰ سے ہوتا ہے۔

منافقوں کی عادت تھی کہ ظاہراً ایمان اور اندر کفر تھا۔ تو یہ عملی دھوکہ ہے روش کا دھوکہ ہے۔ تو فرمایا۔ یخدعون اللہ والذین امنو۔ اللہ کو دھوکہ دینا۔ تو اللہ کو عملاً دھوکہ ہے اعتقاداً نہیں۔ لیکن مؤمن کو عملاً بھی دے سکتے ہیں اور اعتقاداً بھی۔ تو منافق کی دو خصلتیں ہوئیں۔ (1) اللہ کو دھوکہ دینا۔ (2) مومن کو دھوکہ دینا۔ کہ فلاں آدمی منافق ہے اور فلاں صادق ہے۔ منافق کے مقابلے میں، مخلص اور صادق دو الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ الٰہی دفتر میں مجھے منافق شمار نہ کیا جائے۔ تو اسے چاہیے کہ وہ

اخلاص اور صادق کا معنی جان لے۔

وماامروا الا لیعبدواللہ مخلصین لہ الدین۔ تمام پیغمبروں کو اخلاص کی تعلیم دی گئی ہے۔ الا للہ الدین الخالص۔ شیطان نے کہا۔ لاغوینھم اجمعین الا عباداللہ المخلصین۔ شیطان کہتا ہے کہ میں اخلاص کے ماسوا تمام لوگوں پر قابو پالوں گا۔ اس کے تحت امام غزالی رحمت اللہ علیہ نے مثال دی کہ بنی اسرائیل کے ایک عابد شخص کو کسی نے کہا کہ تمہاری قوم تو درخت کی پرستش کر رہی ہے۔ دیندار شخص تھا اس نے سوچا کہ اس کو کاٹ دوں۔ کیونکہ قوم تو شرک کر رہی ہے۔ تو اپنی چلہ گاہ سے نکلا اور درخت کاٹنے چل دیا۔ شیطان انسانی صورت میں آیا۔ کہنے لگا آپ تو اللہ تعالےٰ کی عبادت میں مشغول تھے۔ اسے کاٹو گے تو جھگڑے پیدا ہوجائیں گے۔ لوگ ناراض ہونگے۔ یہ قاعدہ یاد رکھو کہ جس بات پر اللہ تعالےٰ سب سے زیادہ ناراض ہوں۔ شیطان اس بات پر زیادہ خوش ہوتا ہے۔ تو شیطان نے بہت ٹال مٹول کی اور رکاوٹیں پیدا کیں کہ میں نہیں کاٹنے دونگا۔ گفتگو سے ہاتھا پائی شروع ہوئی بزرگ نے شیطان کو گرا دیا۔ تو شیطان نے معافی مانگ لی۔ بزرگ درخت کی طرف چل دیے پھر اس نے رکاوٹیں پیدا کیں پھر لڑائی شروع ہوئی۔ دوبارہ بھی بزرگ نے گرا دیا۔ پھر تیسری مرتبہ بھی اس طرح پچھاڑا۔ آخر شیطان نے دوسری تدبیر سوچی کہ میں آپ کو ایک

تدبیر بتاتا ہوں اس سے مسلمانوں کا فائدہ ہوگا۔ کہ آپ واپس چلے جائیں آپکے تکیہ کے نیچے دو اشرفیاں پڑی ہونگی وہ لیلو اور لنگر پکا کر لوگوں کو کھلاؤ۔ مسلمانوں کو فائدہ ہوگا۔ بزرگ واپس چلے گئے دیکھا اشرفیاں پڑی ہیں اٹھالیں لنگر پکا کر تقسیم کر دیا۔ روزانہ اشرفیاں ملتیں اور آپ لنگر پکاتے۔ چوتھی رات نہ آئیں تو بزرگ صبح پھر درخت کاٹنے چلے گئے۔ پھر شیطان انسانی صورت میں آگیا۔ کہا بڑے میاں کہاں جارہے ہو؟ آپ نے فرمایا درخت کاٹنے۔ شیطان نے کہا وہ چیز ملے یا نہ ملے میں درخت نہیں کاٹنے دونگا۔ لڑائی شروع ہوئی بزرگ ہار گئے اور معافی مانگ کر واپس چلے گئے۔ چونکہ اب خلوص نہیں تھا تو مار کھا گئے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قصہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ جو کام اللہ تعالےٰ کے لئے ہو اس میں اللہ تعالےٰ کی امداد شامل ہوتی ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اخلاص کا معنی بھی خود اللہ تعالےٰ نے بیان کیا ہے۔ خالصاً سائغاً للشربین کہ میں گوبر خون اور گندگی والے پیٹ سے خالص دودھ نکالتا ہوں۔ تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جس طرح دودھ میں خون اور گوبر وغیرہ کی آمیزش نہیں اسی طرح عمل میں صرف اللہ تعالےٰ کی خوشنودی ہو اور کسی مقصد کی آمیزش نہو۔ یہ تو خالص کا معنی ہوا۔ اور اخلاص یہ ہے کہ عمل صرف رضاءِ الٰہی کے لئے ہو۔ اپنے

مومن کو مخلص اور صادق کہا جائے گا۔ صدق حقیقت میں اس چیز کا نام ہے کہ جب آدمی اخلاص کے تحت کام کرنے تو اسے عمدہ سے عمدہ کرے۔ کیونکہ جو کام اخلاص اور صدق کیساتھ کرے گا اس میں کھوٹ نہو گا۔ اگر ہم دین کے کام میں مخلص اور صادق ہیں تو دینی کام کی وجہ سے اسے اعلیٰ سے اعلیٰ صورت میں سر انجام دیں گے۔

حضرت تھانوی رحمت اللہ علیہ نے شریعت اور طریقت نامی کتاب میں لکھا ہے کہ ایمان میں خلوص یہ ہے کہ نظریات اور بدیہیات۔ بدیہیات وہ باتیں ہیں جو قطعی اور یقینی طور پر معلوم ہیں۔ نظریات وہ ہیں جو بدیہیات کی طرح صاف طور معلوم نہوں بلکہ کسی دلیل کے ساتھ معلوم ہوں۔ اب ذرا آسان لفظوں میں سمجھاتا ہوں کہ جو چیزیں اپنی آنکھ سے دیکھیں یہ بدیہیات ہیں۔ اور جو اللہ تعالےٰ فرمادیں کہ جنت و جہنم ہو گی۔ عذاب قبر ہو گا وغیرہ یہ نظریات ہیں۔

تو حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ محققین کی رائے یہ ہے کہ اخلاص اور صدق یہ ہے کہ نظریات بدیہیات بن جائیں۔ یعنی نظریات آنکھوں دیکھی بن جائیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ عبادات عادات بن جائیں۔ دیکھو جب انسان میں اخلاص اور صدق ہو تو پھر عبادت عادت بن جاتی ہے۔ جس طرح سانس لینا

ایک عادت ہے۔ کیا سانس لینے سے کسی کو تکلیف ہوتی ہے۔ بھوک کے وقت کھانا کھانا انسان کی عادت ہے۔ کیا کھانا کھاتے وقت تکلیف ہوتی ہے؟ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا ہے کہ جو چیزیں حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں اگر انہیں آنکھ سے دیکھ لوں تو ذرہ بھر بھی یقین میں اضافہ نہو گا۔ یعنی اللہ تعالےٰ اور حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اتنا اعتماد ہے کہ ان کا فرمان آنکھ کے دیکھے برابر ہے۔ تو خلوص کی شرط یہ ہے کہ نظریات بدیہیات بن جائیں۔ اور عبادات عادات بن جائیں۔ رسالہ قشیریہ میں منقول ہے کہ بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہے کہ جنت میں اللہ کی طرف سے کوئی عبادت نہیں کیونکہ وہ عمل کی جگہ نہیں بلکہ وہ تو عمل کے ثمرہ کا مقام ہے۔ مگر چونکہ وہاں عبادت کی ممانعت بھی نہیں ہو گی تو ہم نماز پڑھتے رہیں گے۔

حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے کہ میں موسیٰ علیہ السلام پر گذرا تو رایت موسیٰ یصلی فی قبرہ موسیٰ قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک بزرگ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ہر وقت پوچھتے رہتے تھے کہ میاں نماز کا وقت ہے یا نہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ ہر وقت یہ کیوں پوچھتے رہتے ہیں۔ فرمایا نماز کے وقت اتنی خوشی ہوتی ہے جیسے دولہا دلہن کے پاس جا رہا ہو۔ تو لہٰذا ہمیں بھی روزانہ پانچ وقت شادی جیسی خوشی ہونی

جاہے۔

پیرانِ پیر حضرت بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کو سلطان سنجر نے لکھا کہ نیم روز کا علاقہ لنگر کیلئے پیش کرتا ہوں۔ تو آپنے خط کا جواب اشعار میں دیا۔ وہ ہماری طرح کے پیر تو نہ تھے وہ تو پیرانِ پیر تھے۔ سیاہ رنگ کی چھتری سب سے پہلے ملک سنجر میں استعمال ہوئی ہے۔ تو فرمایا۔ تو تو نیم روز کا علاقہ لنگر کیلئے پیش کرتا ہے۔ مگر خدا تعالےٰ ملک سنجر کی کالی چھتری کیطرح میرا منہ کالا کرے اگر میرے دل میں تیری پوری سلطنت کی بھی خواہش ہو۔ بس آدھی رات کو تہجد پڑھنا یہ ہماری سلطنت ہے۔ یہ اخلاص اور صدق تھا۔

حضرت صدیق اکبرؓ کو اسیلئے صدیق کہا جاتا ہے۔ من النبین والصدیقین۔ قرآن نے نبی کے بعد صدیق کا مقام لایا ہے۔ انما المومنون الذین امنو باللہ ورسولہ وجاہدوا باموالہم وانفسہم فی سبیل اللہ۔ کہ اللہ پر ایمان لائے اور پھر نفس کو اللہ اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر کھپا دے۔ اولٰئک ہم الصٰدقون کہ یہ صادق مومن ہیں۔ صادق مومن وہ ہے جو دین پر پختہ یقین رکھے اور دین پر اپنی جان ومال کھپا دے۔ انگریزوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے پوری دنیا کو شکست دی مگر ہم مٹھی بھر ہو کر ان سے جیتے ہیں۔

اس کی وجہ لکھتے ہیں کہ جب مسلمان فاتح تھا تو خالص دین وایمان سے لڑتے تھے۔ اب جب ہم نے ان کی بڑی سلطنت

ان سے فتح کی ہے یا ان سے چھینی ہے تو ان میں دینی مقصد نہ تھا۔ ان کا ایمان کمزور تھا۔

اب بھی مسلمان دینی مقصد پر منظم نہیں ہیں۔ قل ان کان آباءکم واخوانکم........وتجارة تخشون کسادھا........فتربصوا........ اے پیغمبر انھیں بتا دو اگر تمہارے باپ۔ بیٹے۔ بھائی۔ بیویاں۔ کنبہ اور وہ مال جو تم کماتے ہو یا تجارت جس کے فیل ہونیکا تمہیں ڈر ہو۔ اگر یہ تمام چیزیں اللہ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے اور دین میں جد وجہد کرنے میں تم کو محبوب ہوں تو تم انتظار کرو کہ اللہ کا قہر آنیوالا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے یہ سب چیزیں ختم کر دی تھیں۔ اللہ تعالے سے کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ اخلاص تھا۔

نفاق کا مدمقابل صدق اور اخلاص ہے۔ اور ان دونوں کی جڑ محبت ہے۔ اگر آدمی ایمان میں صادق بننا چاہے تو اس کی بنیادی صفت یہ ہے کہ اسے اللہ اور اسکی محبوب چیز سے محبت ہو۔ والذین امنوا اشد حباً للہ۔ واقعی انسان محبت اور عشق میں صادق اور مخلص ہوتا ہے۔ ہر عاشق اپنے معشوق کیلئے خالص اور صادق ہوتا ہے۔ اللہ تعالے نے یہ چیزیں قرآن کی پہلی سورۃ بقرہ میں رکھیں۔ مگر ہم حیران ہیں کہ مومن میں منافقانہ خصلتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ دیکھو مومن کی خصلت خلوص اور صدق ہے۔ اور منافق کی خصلت اللہ تعالے اور مومن کو دھوکہ دینا ہے۔

مگر آج دیکھو کہ دودھ میں پانی - دیسی گھی میں ڈالڈا-
آٹے میں باسی روٹیاں ملائی جا رہی ہیں- یہ سب چیزیں اخبار میں
آچکی ہیں- ان کا مرکز کراچی ہے- پشاور میں ایک جگہ چائے کی پتی
میں لذت محسوس نہوئی تو معلوم ہوا کہ اس میں سیاہ چنوں کے چھلکے-
اور مسور کی دال کے چھلکے ملائے جا رہے ہیں - ایک شخص نے
تصدیق بھی کر دی کہ میری دکان سے دو لڑکے سیاہ چنوں کے چھلکے
لیجا کر چائے کی پتی میں ملاتے ہیں-

یہ کون ملاوٹ کر رہا ہے یہ شیطان تارا سنگھ نہیں-
بلکہ درود و سلام کہنے والا عاشق رسول - پکا مسلمان یہ حرکتیں کر رہا
ہے- آج تو اخبار میں تھا کہ کراچی میں چونکہ پانی فروخت ہوتا ہے
اس میں سمندر کے پانی کی ملاوٹ کی جارہی ہے- پاکستان میں تو پانی
بھی خالص نھیں ملتا- میں نے کہا ایک چیز ہے جو خالص ملتی ہے-
(وہ ہے خالص گناہ) نیکی تو کوئی بھی خالص نہ رہی- اس سے تو
بھوکا مرنا بہت اچھا ہے- یخدعون اللہ والذین امنو- کیا یہ قرآن
نھیں کہ منافق اللہ اور لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں؟ ہم اپنے گریبانوں
میں کیوں نھیں جھانکتے، کیا ہم میں منافقین کی خصلتیں پیدا نہیں
ہوگئیں؟

حدیث پاک میں ہے کہ جو تاجر امین ہو اور سچ بولتا
ہو وہ قیامت کے دن نبی اور صدیقین کے ساتھ ہوگا- تاجر کو چاہے

کہ سوچ سمجھ کر معاملہ کرے۔ اگر وہ خریدار سے کہ بیٹھے کہ میں اس چیز میں نفع نہیں لے رہا یا اتنا نفع لے رہا ہوں۔ تو پہلی صورت میں اگر نفع لیا اور دوسری صورت میں مقرر سے زائد لیا تو دونوں صورتوں میں کمائی حرام ہو جائیگی۔ دھوکہ نہو اخلاص ہو۔ رزقِ حلال سے تو نور پیدا ہوتا ہے۔ ایک بار حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ سے باہر تشریف لائے دیکھا کہ ایک صحابیؓ کھجور کا ڈھیر لئے کھڑے ہیں۔ جو اوپر سے خشک اور اندر سے گیلے ہیں۔ آپ نے فرمایا گیلی اور خشک کھجور کو آپس میں ملا دو تا کہ دھوکہ نہو۔ اور پھر فرمایا جو مجھے اور میری امت کو دھوکہ دے وہ مجھ سے نہیں۔ میرے ایک شاگرد نے گائے خریدی جو خوبصورت تھی اسکا شیردان تو بہت بڑا تھا مگر دودھ کم دیتی تھی۔ تو مولوی صاحب اسے بدھ کے روز تحصیل چارسدہ بیچنے کیلئے لائے۔ خریدار کو تمام نقص بتلا دیتے۔ کوئی بھی نہیں خریدتا تھا۔ کئی بدھ لے آتا اور واپس لے جاتا۔ دعا کیلئے آیا کہ میں اسے شریعت کے مطابق بیچنا چاہتا ہوں کوئی لیتا ہی نہیں۔ میں نے کہا بھائی اسے قصائی کے پاس فروخت کر دو۔ آج گویا مسلمان کا طرز زندگی بدل گیا ہے۔ کہ اگر کوئی پختہ طور پر ایمان پر چلنا چاہے تو وہ نہیں چل سکتا۔ دیکھو آج پورا معاشرہ رشوت خوروں کا ہے۔ اگر ایک نیک آدمی آجائے تو وہ زندگی نہیں گزار سکتا۔ آج کے درس میں مومنوں کو دھوکہ دینے

کی مثال دی گئی ہے۔ باقی رہی اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا یہ مضمون ذرا مشکل ہے اسے دوسرے درس میں بیان کروں گا۔

درس نمبر ۱۸
6 نومبر 1966ء

منافق اللہ کو دھوکہ دیتا ہے

گذشتہ درس میں منافقوں کی دوسری خصلت کا بیان تھا۔ کہ وہ مومنین کو اور اللہ تعالے کو بھی دھوکہ دیتے ہیں۔

تو اللہ تعالےٰ سے دھوکہ کا یہ معنی نہیں کہ اسے حقیقی دھوکہ دے سکیں۔ بلکہ عملی دھوکہ دیتے ہیں۔ جس طرح دھوکہ باز عملی دھوکہ دیتا ہے۔ تو مومنین کو دھوکہ دینے کا بیان گذشتہ درس میں گذرا۔ اور اب اللہ تعالےٰ کو دھوکہ دینے کا بیان ہے۔ جو صدق سے عمل کرے وہ مومن ہے۔ اور جس میں صدق اور اخلاص نہو تو سمجھا جائیگا کہ یہ منافقانہ خصلت ہے۔ مثلاً سب سے پہلے نماز کو لے لو۔ مومن کی نماز اور ہے۔ لیکن قرآن میں اللہ تعالےٰ نے منافق کی نماز کا بیان فرمایا ہے۔ کہ منافق کس طرح نماز پڑھتے ہیں۔ واذاقاموا ← الی الصلوٰۃ قاموا کسلیٰ۔ کہ منافق نماز کیلئے سستی سے کھڑا ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ جو جانتا ہے کہ اس کے قلب میں شوقِ صلوٰۃ ہے کہ نہیں۔ تو ہر مومن اپنے اندر دیکھے کہ میں

مومن والی یا منافق والی نماز ادا کر رہا ہوں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی دنیاوی کام کرتا ہے۔ اس میں نہ وہ سستی کرتا ہے اور نہ بے شوقی کرتا ہے۔ اور نہ ہی اسے تھکاوٹ ہوتی ہے خوب دلجمعی اور لگن سے کرتا ہے۔ اسی طرح مومن کو چاہیے کہ وہ نماز کو بھی دولت سمجھ کر کھڑا ہو۔ جس میں بے شوقی، سستی و کاہلی نہ کرے بلکہ دلجمعی اور خوب لگن سے نماز ادا کرے۔

حدیث پاک ہے الصلوۃ مناجات رب العالمین کہ نماز اللہ تعالےٰ سے ہم کلامی ہے۔ اگر ایک آدمی اس انتظار میں ہو کہ صدر یا گورنر مجھے ملاقات کا وقت دے۔ تو اسے وقت مل گیا۔ تو کیا وہ اس وقت میں سستی کرے گا؟ ہرگز نہیں۔ اگر ملاقات کا وقت دس بجے ہے تو وہ چھ بجے یا اس سے پہلے تیاری شروع کر دیگا۔ یہ ایک اپنے جیسے انسان سے ملاقات کرنی ہے۔ اور پوری زینت کیساتھ خوب بن ٹھن کر جاتا ہے۔ مگر رب العالمین کے ساتھ دن میں پانچ وقت ملاقات کا وقت ہے۔ اذان کا معنی ہے کہ ملاقات کی اجازت ہے آجاؤ۔ تو اگر اعلی لباس کی فرصت نہیں صاف ستھرا تو ہو۔ بہتر تو یہ ہے کہ جس لباس سے صدر یا گورنر سے ملاقات پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح نماز بھی ایسے لباس میں نہ پڑھو۔ اسیوجہ سے فقہاء نے نماز میں بعض چیزوں کو مکروہ قرار دیا ہے۔ مثلاً ننگے سر نماز پڑھنا یہ مکروہ ہے یا اچھے کپڑے موجود ہوں وہ نہ پہنے اور عام

کاروباری کپڑوں سے نماز پڑھنا اسے بھی فقہاء نے مکروہ قرار دیا ہے۔اور خود اللہ تعالےٰ نے بھی آداب کے لحاظ سے وضوٗ شرط قرار دیا ہے۔ تو انسان کو چستی کا سبق دیا گیا ہے۔ اور منافق نماز ترک نہیں کرتے تھے بلکہ سستی کرتے تھے۔

مشکوۃ شریف کی حدیث ہے کہ اور کوئی ایسا عمل نہیں جس کے تارک کو ہم کافر لکھیں مگر ایک نماز ہے کہ اس کے تارک کو ہم کافر جانتے تھے۔ تو مومن کو چاہیے کہ نماز کو شوق سے پڑھے۔ تاکہ مومن اور منافق کی نماز میں فرق ہو جائے۔ باقی رہا اخلاص وہ اللہ تعالےٰ بہتر جانتا ہے۔ اگر اخلاص سے نماز پڑھنی ہے تو اللہ تعالےٰ کی ملاقات کے لئے جو سنن و مستحبات ہیں وہ علماء کرام سے پوچھو۔ بعینہ ایسے جس طرح کسی بادشاہ یا صدر کے دربار میں جانے سے پہلے لوگوں سے اسکی ملاقات کے اصول پوچھتے ہو۔ دیکھو قومہ اور جلسہ، قعدہ وغیرہ میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے۔ حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ اور اہل حدیث کا قول ہے کہ اگر ان میں کوتاہی ہو گئی تو نماز فوت ہو گئی۔ اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے اور امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ رفاعہؓ بن رافع کی روایت ہے کہ ایک شخص آیا وہ نماز پڑھنے لگا۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم اسکی نماز کو دیکھتے رہے۔ تو اس نے قومہ و جلسہ میں کوتاہی کی۔ جب فارغ ہو کر جانے لگا تو

آپ نے فرمایا ثم فصل فانک لم تصل کہ تو نے نماز نہیں پڑھی پھر پڑھو۔ اس نے تین نے بار پڑھی آپ ہر بار یہی فرماتے رہے ثم فصل فانک لم تصل۔ پھر اس نے عرض کی یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مجھے اس سے بہتر اور کوئی نماز نہیں آتی۔ پھر آپ نے فرمایا۔ فاطمئن قائماً۔ کہ رکوع کے بعد کچھ کھڑے رہو۔

فاطمئن قاعداً۔ سجدہ کے بعد کچھ دیر بیٹھ جاؤ۔ اب یہ شبہ پیدا ہوا کہ یہی چیز پہلی بار کیوں نہیں فرمائی۔ دیکھو حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم حکیم تھے آپ کا ہر طرز عمل امت کے لئے سبق آموز ہے۔ آپ نے یہ اندازہ لگانا چاہا کہ یہ حالت حقیقی طور پر ہے یا اتفاقاً۔ تو پہلی مرتبہ حکمت حاصل نہیں ہوتی۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ اگر پہلی بار یہ بات بتلادیجاتی تو شاید اس بات کو دل میں نہ جماتا۔ اور جب خوب ٹھوکر کھائے گا تو بعد میں بتلانے سے اس کے قلب میں بیٹھ جائیگی۔ تو آپ نے ان دو حکمتوں کے تحت تین مرتبہ کے بعد فرمایا۔

حضرت تھانویؒ کے پاس ایک آدمی آیا کہنے لگا تعویذ دو۔ آپ نے فرمایا باہر لوگوں سے پوچھ آؤ کہ میں نے پوری بات کہی ہے؟ لوگوں نے کہا تم نے ادھوری بات کہی ہے تمہیں جس مرض وغیرہ کے لئے تعویذ درکار ہے اس کا نام بھی لو۔ تو پھر جا کر کہا کہ مجھے آسیب کا تعویذ چاہیے۔ تو اس پر حضرت تھانوی رحمتہ

اللہ علیہ نے فرمایا کہ آئندہ پوری بات کیا کرو۔

تو نماز کو پورے آداب سے ادا کرنا چاہیے۔ حدیث شریف میں ہے کہ انسان دنیا کے دھندوں میں لگا رہتا ہے اور عصر کی نماز میں تاخیر کر دیتا ہے۔ پھر جب سورج غروب ہونے کے قریب آتا ہے تو جلدی جلدی نماز ادا کرتا ہے۔ سجدے ایسے کرتا ہے جیسے مرغا زمین پر چونچ مارتا ہو۔ اللہ تعالےٰ کو مومن کی طرح یاد نہیں کرتا تو آپ نے تین بار فرمایا صلوۃ المنافق۔ کہ ایسی صورت میں منافق نماز پڑھتا ہے۔ تو عصر کی نماز کا خاص خیال رکھا جائے وقت تنگ ہوتا ہے۔ اگر پورے وقت پر ادا کی جائے تو پھر سکون سے پڑھی جاسکتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز بہت اہم چیز ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں میاں ضروری کام تھا اس لئے تاخیر ہو گئی ہے۔ میاں نماز سے بھی کوئی ضروری چیز ہے؟ ابن بطوطہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ میں خوارزم گیا۔ علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ اسی جگہ کے رہنے والے تھے۔ لکھتے ہیں کہ جمعہ کے دن خوارزم کے بازار میں گھوم پھر رہا تھا۔ بازار میں خوب بھیڑ تھی مگر جب جمعہ کی اذان ہوئی تو معلوم ہوتا تھا کہ بازار میں کوئی انسان ہی نہیں۔

نماز سے بڑھ کر کوئی اور کام بھی اہم ہے؟ یہ ایک خصلت ہے کہ نماز پورے خلوص سے ادا کرنی چاہیے نہ کہ چالبازی

سے اور ٹھگی سے۔ اور اخلاص کی حد یہ بھی ہے کہ رضا الہٰی کے سوا اور کوئی مقصد شامل نہو۔ اور بسا اوقات آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ مقصد نہیں مگر مقصد ہوتا ہے۔ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب، شریعت اور طریقت، میں لکھا ہے کہ ایک شخص عرصہ تیس سال سے مسجد حرام میں پہلی صف میں نماز پڑھتے چلے آرہے تھے۔ اتفاق سے ایک دن دیر سے آئے تو دوسری صف میں کھڑے ہو گئے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو نمازوں کا اعادہ شروع کر دیا۔ کسی نے پوچھا کیا بات ہے فرمانے لگے کہ تیس سال بعد دیر ہو گئی ہے جب لوگوں نے جماعت ختم کی۔ سلام پھیرا تو مجھے ذرا شرم محسوس ہوئی کہ لوگ کیا خیال کریں گے۔ تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ صف اول والی نمازیں مخلوق کی رضا کیلئے تھیں۔ نہ کہ خالص خدا تعالے کیلئے۔ اس لئے پہلی نمازیں لوٹا رہا ہوں۔ تو کسی نے کہا کہ صرف ایک دن کی لوٹا دو۔ فرمانے لگے کہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرے اندر یہ مرض پہلے سے چلی آرہی ہے۔ ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا۔ اللہ تعالے کو شرک پسند نہیں۔

حدیث پاک ہے۔ لو علمتم مافی النداء وصف اول۔ تمہیں اگر آذان اور صف اول کے ثواب کا علم ہو جائے تو اگر چل نہ سکیں گے تو گھٹنوں کے بل چل کر آئیں گے۔ حضرت فاروق اعظمؓ فرماتے تھے اگر مجھ پر خلافت کا بوجھ نہوتا تو میں مؤذن بنتا۔ المؤذن

اطول اعناقاً۔ کہ قیامت کے دن سب سے بلند اور اونچی گردن موذنوں کی ہوگی۔ معلوم ہوگیا کہ انہیں کسی اونچی جگہ پر کھڑا کیا جائیگا۔ دوسری حدیث شریف میں ہے کہ اگر کوئی سات سال اذان دے۔ تو گواہی دو کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہے۔ علماء کا اختلاف ہے کہ ایثار فی القرب جائز ہے کہ نہیں۔ کہ ایک آدمی پہلی صف میں اپنی جگہ کسی دوسرے بھائی کے لئے چھوڑ دے۔ اس میں ایک قول یہ ہے کہ اگر دنیا کے معاملے میں ایثار ہو تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن محققین کا قول ہے جو اپنی پہلی صف والی جگہ دوسرے بھائی کو دیگا تو اسے بھی پہلی ہی صف کا ثواب ملے گا۔ اور مزید اسے ایثار کا دوسرا ثواب بھی ملے گا۔

اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں ایمان کی قدر یہ ہے کہ بوڑھے کی قدر کرے۔ ان اللہ یستحی من شیبتہ المسلم۔ کہ اللہ تعالےٰ کو بوڑھے سے حیا آتی ہے۔ حدیث شریف ہے کہ جو ہمارے چھوٹے پر شفقت اور اپنے بڑے کی قدر نہ کرے وہ ہم سے نہیں۔

تو قرآن میں کسل فی الصلوۃ منافقوں کی مذکور ہے۔ اسی طرح باقی عبادات روزہ۔ حج۔ زکوۃ وغیرہ سب میں منافق سستی کرتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کو دھوکہ دینا ہے۔

منافقوں کی ایک خصلت یہ بھی ہے کہ اگر دین کے کام میں دنیوی فائدہ ہو تو اسے کرتا ہے۔ اور اگر دنیوی فائدہ نہو تو

اس سے جی چراتا ہے۔ یہ مسلمانوں کیساتھ شریک ہو کر کفار سے جنگ بھی لڑتے تھے۔ کیونکہ مال غنیمت ملتا تھا۔ لیکن جنگ تبوک کے موقعہ پر یہ نہ گئے۔ کیونکہ ریتلے علاقے کا سفر تھا بس ٹال مٹول کر گئے۔ یہ جنگ ہرقل سے لڑنی تھی۔

لَوْكَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ وَلٰكِن بَعُدَتْ۔ اگر دنیا کا فائدہ قریب ہو اور سفر قریب ہو۔ دیکھو دین کے کام میں اگر دنیا کا فائدہ آئے تو بے شک آئے۔ مگر دنیوی فائدے کا خود ارادہ نہ کیا جائے۔ مثلاً حج کیلئے جاتا ہے تو خالص حج کا ارادہ ہو۔ اگر ارادہ محض اور خالص حج کا ہو مگر ضمنی طور پر تجارت بھی ہو جائے تو شرعاً اجازت ہے۔ اور اگر تجارت کا ارادہ ہو اور نام حج کا لے تو یہ حج نہوا۔ یہ چیز قرآن سے ثابت ہے۔ اور یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اس شخص کی نیت درست ہے یعنی خالص حج کی نیت ہے۔ حکومت کی طرف سے اگر تجارت کی بندش ہو اور وہ چلا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ حج کے ارادہ سے گیا ہے۔ اور اگر تجارت کی بندش ہو اور وہ حج پر نہ جائے تو جانو کہ اسکی نیت تجارت کی تھی۔

مثال حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر ایک آدمی بھوکا ہو۔ ادھر نماز کیلئے جماعت شروع ہو رہی ہو تو بھوکے کو چاہیے کہ وہ نماز بعد میں پڑھے پہلے کھانا کھا لے۔ کیونکہ جب بندہ اور اللہ تعالےٰ کے حق میں ٹکراؤ ہو جائے تو اللہ تعالےٰ

فرماتے ہیں کہ میرا حق چھوڑ دو اور اپنا حق پورا کر لو۔

حدیث شریف ہے کہ اگر میں یہ سارا کھانا نماز بنا دوں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ نماز کو کھانا بنا دوں۔ مطلب یہ کہ اگر بھوک کی حالت میں نماز پڑھی جائے تو دھیان تو کھانے کی طرف رہیگا۔ تو نماز کھانا بن جاتی۔

حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے کسی دوسرے امام کا واقعہ لکھا ہے۔ کہ فرض کر لو ایک شخص کے ذمہ ہزار روپیہ قرضہ ہے۔ وہ اپنا قرضہ نہیں اتارتا اور نیکی پر رقم خرچ کر دیتا ہے مثلاً مسجد بنواتا ہے یا مدرسہ وغیرہ میں رقم دیدیتا ہے تو شرعاً یہ صورت منع ہے۔

ایک جنازہ آیا اس پر قرض تھا۔ حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسکی نماز جنازہ پڑھانے سے انکار فرما دیا۔ آپ نے جب یہ سوچا کہ یہ میرے جنازہ پڑھانے سے محروم رہیگا۔ تو اس پر آپ نے فرمایا کہ جو میت قرض دار ہو اس کا قرضہ میں اتار دونگا اور اسکی جائداد اس کے ورثاء لیں گے۔ یہ طریقہ ہے پیری اور مریدی کا۔ مگر آج کل بھی دیکھ لو کہ کیا کیا جا رہا ہے۔ حضور پاک صلے اللہ علیہ وسلم میت کا قرضہ بھی ادا کیا کرتے تھے اور جنازہ بھی پڑھاتے تھے۔

درس نمبر۱۹
13 نومبر 1966ء

مؤمن کا ظاہر و باطن ایک ہو

نفاق کی ایک بری خصلت اللہ تعالےٰ کے ساتھ دھوکہ بازی کرنا اور یہ چیز اللہ تعالےٰ کو ناپسند ہے کہ مومنوں کو دھوکہ دے۔ اگر کوئی نفاق کی اس خبیث خصلت سے بچنا چاہتا ہے۔ تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالےٰ اور مومن کے لئے اس کا ظاہر و باطن ایک برابر ہو۔ اور جس کے ظاہر و باطن میں فرق ہو وہ مخلص نہیں۔ وہ منافقین میں سے ہے۔ فقط ظاہر اور فقط باطن کے اچھے ہو جانے سے انسان اچھا نہیں بنتا۔ آج کل بہت افراط و تفریط کی جاتی ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ اندر و باہر دونوں اچھے ہوں۔ ظاہر کا معنی یہ کہ جو نیکی کیجائے وہ اللہ و رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کر کی جائے۔ خود اپنے دماغ سے نیکی تیار نہ کرلی جائے۔ نیکی و بدی کا تقرر کرنا تو شریعت کا کام ہے۔ اللہ تعالےٰ کا کام ہے۔ ہم نیکی پر چلنے والے ہیں۔ نہ کہ نیکی بنانے والے، بہت سی نیکیاں ایسی ہیں جو ہمارے قیاس کے خلاف

ہیں۔ مثلاً رمضان کے روزے رکھنا نیکی ہے مگر عید کو روزہ رکھو تو گناہ ہے۔ آپ یہاں خدا تعالیٰ کو کیوں نہیں کہتے کہ ہم نے روزہ رکھا ہے آپ اسے گناہ کیوں قرار دیتے ہیں؟ تو نیکی و بدی بنانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اسی طرح اگر پہلے قعدہ میں قصداً درود پڑھا کہ یا اللہ درود و سلام ہو محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر تو نماز نہ ہوئی۔ اور اگر غلطی سے پڑھا تو پھر سجدہ سہو ہے۔ دیکھو ہے تو درود شریف، جس میں کتنی برکتیں اور رحمتیں ہیں۔ مگر موقع اللہ کی مرضی کے خلاف تھا تو یہ سہو ہے یا خود نماز نہ ہوئی۔

مسلمان کو عادت ڈالنی تھی کہ نیکی اور اس کا محل دونوں اللہ تعالیٰ سے پوچھو۔ مثلاً تہجد اور اشراق وغیرہ نیکی ہیں مگر وقت پر۔ اگر صبح صادق ہو گئی تو پھر تہجد نہیں۔ اس طرح اگر سورج نکلنے سے پہلے اشراق پڑھ لے تو نہ ہوگی بلکہ گناہ ہوا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں جو کوئی اشراق کی چار رکعت یوں پڑھا کرے گا اس کی دنیاوی مشکلات دور ہو جائیں گی۔ پہلی دو رکعت میں ایک میں والشمس اور دوسری میں واللیل تلاوت کرے۔ اور دوسری نفل کی پہلی رکعت میں والضحیٰ اور دوسری میں الم نشرح تلاوت کرے۔

تو نیکی اور اس کا محل خدا تعالیٰ سے پوچھے۔ لاصلوۃ بعد الفجر حتی تطلع الشمس ولاصلوۃ بعد العصر حتی غربت الشمس۔ (2) اب

اگر ان وقتوں میں نماز پڑھیگا تو نماز تو نماز رہی الٹا گناہ ہوگا۔ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کا مقولہ ہے۔ کہ قانون اللہ تعالےٰ کا ہے اس میں کسی کو ترمیم کرنے کا حق نہیں۔ آپ نے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ایک افغانستان کا پٹھان گاڑی میں ایک من سامان لے کر جا رہا تھا۔ گارڈ نے زائد وزن کی رقم مانگی وہ کہنے لگا یہ قانون تمہارے لئے ہے کہ تم ہندوستانی ہو تم صرف پندرہ سیر وزن اٹھا سکتے ہو ہم طاقتور ہیں ہم ایک من وزن اٹھا سکتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کیا حکومت اس وضاحت کو تسلیم کریگی؟ نہیں بلکہ جواب ملے گا تم کون ہو قانون ہم بنائیں اور توضیح و تشریح تم کرو۔

قانون اللہ تعالےٰ نے بنایا ہے اور تشریح ڈاکٹر فضل الرحمان اور پرویز کر رہے ہیں۔ نیکی و بدی کی وضاحت وہ کرے گا جس نے قانون بنایا ہو۔ یہ تو نہیں کہ خداتعالےٰ سود کو حرام فرما دیں اور ڈاکٹر فضل الرحمان سود کو حلال کر دے تو جائز ہو گیا۔

کل ایک صاحب آئے کہنے لگے میرا پڑوسی بہت غریب ہے کیا اسے سود کا پیسہ دے سکتا ہوں۔ میں نے اسے کہا یہ بھی جائز نہیں وہ حیران ہو گیا۔ میں نے کہا اگر یہ ناجائز نہوتا تو کل کہو گے کہ چوری کر کے ان غریبوں میں تقسیم کر دیں۔ اگر چوری

کرتے وقت پکڑے گئے تو کیا عدالت معاف کریگی؟ کھنے لگا نھیں
میں نے کھا اسی طرح اللہ رب العزت بھی معاف نھیں کریں گے۔
(آپ نے ایک مرتبہ یہ مسئلہ بیان فرمایا تھا کہ بینک سے سود کا پیسہ
لیلو۔ مگر کسی غریب کو دیدو اور دیتے وقت یہ نیت کرو کہ یا اللہ میں
اپنے سر سے گناہ اتار رہا ہوں۔) مطلب یہ کہ اگرچہ ظاہر بگڑا ہوا ہو مگر
باطن درست ہو۔ بلکہ یاد رکھو ہر نیکی میں ظاہر و باطن دونوں درست
ہوں۔ عبادت کی صورت بھی فرمودۂ خدا کے مطابق ہو اور باطن بھی
فرمودۂ خدا کے مطابق ہو۔

کائنات کا اس قاعدہ پر عمل ہے کہ ظاہر اور باطن
دونوں مقصود ہیں۔ مثلاً کپڑا خریدتے وقت آپ پہلے رنگ کا
انتخاب کرتے ہیں پھر آپ اس کپڑے کی ساخت دیکھتے ہیں کہ
ملائم ہے یا غیر ملائم کھردرا ہے۔ تو رنگ کپڑے کا ظاہر ہے اور
ساخت کپڑے کی باطن ہے۔ تو ہم کپڑے کا ظاہر اور باطن پوری
طرح سمجھ کر قیمت دیتے ہیں۔ اگر کپڑا اعلی درجہ کا بنا ہوا ہو مگر رنگ
عمدہ نہو تو آدمی نھیں خریدتا۔ نکاح کے معاملہ میں دیکھو کہ ہر آدمی
کی خواہش ہوتی ہے کہ میرے بچے کی بیوی صورۃً اور سیرۃً اچھی ہو۔
یعنی ظاہر و باطن دونوں اچھے ہوں۔ یہاں حضرت تھانوی رحمتہ اللہ
علیہ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ کہ ایک عورت کی شادی ہو رہی
تھی اس نے ماں سے پوچھا کوئی نصیحت کردو۔ ماں نے کھا کہ بولنا

نہیں۔ وہ کچھ بیوقوف تھی اس لئے منع کیا کہ بولے گی تو بیوقوفی ظاہر ہوگی۔ بہت دن گزر گئے وہ نہ بولی تو ایک دن ساس نے کہا کیا بیٹی تو گونگی تو نہیں۔ اس نے کہا والدہ نے منع کیا تھا۔ تو ساس نے کہا کہ میرے ساتھ بولا کرو۔ ساس قریب بیٹھ گئی تو وہ بولتی ہے امی جان یہ بتلانا کہ اگر میں بیوہ ہو گئی تو بتاؤ پھر کس سے شادی کرونگی۔ تو ساس سمجھ گئی کہ بیوقوف ہے۔ تو کہا بیٹی نہ بولا کرو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آج کچھ عجیب سے لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔ انھیں دنیاوی معاملات میں تو ظاہر و باطن مقصود ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ کے معاملہ میں انسان کیوں اندھا بن جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کو وہ نماز پسند ہے جس کا ظاہر و باطن دونوں عمدہ ہوں۔ باطن یہ کہ اخلاص ہو۔

حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا اگر امام رکوع کی صورت میں ہے اسے معلوم ہو جائے کہ فلاں آدمی پہنچنے والا ہے تو کیا وہ اس کے لئے رکوع کو ذرا لمبا کر سکتا ہے تاکہ وہ شامل ہو جائے۔ اخاف علیہ امراً عظیماً۔ مجھے تو اس کیلئے بڑے امر کا خوف ہے۔ کہ کفر۔ کیونکہ نماز اللہ کی عبادت ہے۔ اگر اسے انسان کے لئے لمبا کرے تو یہ انسان کی عبادت ہو گئی۔ جو شرک ہے۔ تو ہر امر کی روح اخلاص ہے۔ آج کل ہر چیز کا عطر اور ست نکالا جاتا ہے۔ پچھلے سالوں بہت پروپیگنڈہ کیا گیا کہ قربانی پر بے فائدہ جانور

ذبح ہو جاتے ہیں۔ ان کی قیمت رپوں کی صورت میں غربا میں تقسیم کر دیجائے۔ اس کا مطلب ہے قربانی نہ کرو۔ دیکھو قربانی کا ایک ظاہر ہے کہ جانور کو ذبح کیا جائے اور ایک باطن ہے وہ جانور کی قیمت ہے۔ تو یہ لوگ قربانی کا باطن (رقم) پسند کرتے ہیں اور ظاہر (ذبح) کرنا پسند نہیں کرتے۔ دیکھو ایک آدمی اسی (80) روپے کا بکرا ذبح کرے اور دوسرا اسّی کروڑ خیرات کرے تو جب بھی یہ گناہگار رہے گا اور اسّی کروڑ سے بھی یہ گناہ نہ دھلے گا۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ نماز باجماعت کا ثواب بغیر جماعت والی سے ستائیس گنا زیادہ ہے۔ تو مولانا عبدالحی لکھنوی رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب میں مولانا محمد بن عبادہ رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ نقل کرتے ہیں۔ محمد بن عبادہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے کبھی باجماعت نماز ترک نہیں ہوئی۔ ماسوا میری والدہ کی وفات کے دن۔ دیکھو لوگوں کو آخرت کی کتنی فکر تھی۔ جس کی آخرت بن گئی اسکا بیڑا پار ہے۔ تو محمد بن عبادہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی قضا شدہ نماز کو 27 بار پڑھا۔ انہوں نے خیال کیا کہ 27 بار پڑھنے سے ثواب برابر ہو گیا۔ رات کو خواب میں ایک شخص کہتا ہے کہ میں اللہ کا پیغام پہنچانے آیا ہوں۔ فکیف تامین الملائکہ۔ کہ فرشتوں کی آمین کا کیا کرو گے۔ باجماعت نماز میں فرشتے شریک ہوتے ہیں جب امام ولاالضالین کہتا ہے تو فرشتے بھی

آمین کہتے ہیں۔ فرشتے پاک ہیں ان کی دعا قبول ہوتی ہے۔ اور جو نماز تنہا پڑھی جائے اس میں فرشتے شریک نہیں ہوتے۔

حضرت امام شافی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے دنیا کے بارے میں پوچھا کہ دنیا کیسی ہے۔ آپ نے فرمایا ایک شاندار محل ہو اسکی تعمیر پر لاکھوں روپے صرف کئے گئے ہوں مگر اسکی بنیادیں برف کی اینٹوں کی ہوں۔ اس نے عرض کی حضرت اسکا کیا مطلب ہے فرمایا آخر برف نے پگھلنا ہے تو پگھلنے پر یہ عمارت دھڑام سے نیچے آگرے گی۔ فرمایا کہ آدمی کی عمر برف ہے۔ جب عمر کی برف پگھلے گی۔ تو یہ موٹر کار۔ بنگلے۔ اقتدار شاہیاں سب ختم ہو جائینگی۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ چیز کا ظاہر و باطن ایک ہو۔ اخلاص ہو۔ آج کل تو اپنے مزاج کے مطابق اسلام کا خلاصہ نکالا جاتا ہے۔ کسی نے یہ نکالا کہ بس قومی ہمدردی ہو باقی کچھ نھیں۔ نہ نماز نہ روزہ وغیرہ۔

اکبر:۔

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوۃ ہے نہ حج
تو خوشی پھر اسکی کیا کوئی جنٹ ہے کوئی جج

دیکھو مشین کے ذریعے دودھ سے مکھن نکال لیا

جائے تو اس دودھ کی قیمت کم ہو گی باوجود اسکے کہ ظاہری شکل و صورت میں دودھ ہے مگر چونکہ باطنی جوہر نہیں اس لئے اس کی کوئی وقعت نہ رہی۔ اسی طرح اگر دودھ میں پیشاب کے قطرے پڑ گئے ہوں تو بھی اس کی کوئی قیمت نہیں کیونکہ اسکا باطن ناپاک ہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ کو ظاہر اور باطن دونوں مقصود ہیں۔ تو ہماری نماز کا ظاہر اور باطن دونوں اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ہوں۔ ایک نمازی نے خواب میں بیان کیا کہ مجھے جب قبر میں اتارا گیا تو مجھے کچھ وحشت ہوئی تو میری نماز اندھی صورت میں آئی میں نے کہا یہ نابینائی کیوں ہے۔ کہا گیا کہ تم آنکھیں بند کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اور اللہ و رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ آنکھیں کھول کر نماز پڑھا کرو۔

میں حیران تھا کہ آنکھ بند کر کے اگر نماز پڑھی جائے تو باطن کو تو ترقی ہوتی ہے۔ کیونکہ سب کا سب خیال اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جاتا ہے۔ مگر نماز اندھی شکل میں کیوں آئی۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ شافعی المذہب ہیں انہوں نے آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنے کا جواز دیا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ صرف خالص اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ ہو۔ لیکن حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک جائز نہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ

تمہارا ظاہر درست نہیں۔ میں نے سوچا یہ کیا راز ہے اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ نماز حقیقت میں معراج المومنین ہے۔ اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر آنکھیں بند کرے۔ کیا صدر ایوب کسی کو بلائے وہ اس کے سامنے آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو جائے۔ اتنا تو صدر ایوب بھی برداشت نہیں کرے گا۔

حدیث پاک ہے کہ تو اس طرح نماز پڑھے کہ گویا تو اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ اگر ایسا نہیں کر سکتا تو اتنا ہو کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اخلاص کا طریقہ بتلا دیا ہے۔ مثلاً اگر ایک آدمی جنگل میں جا رہا ہو اور اتفاق سے قدم قدم پر سو سو کے نوٹ پڑے ہوں اور کوئی شرعی پابندی بھی نہو۔ کیا اس وقت وہ شخص اخلاص کرے گا یا سستی کرے گا۔ جتنے زیادہ نوٹ اٹھائے گا اتنا امیر ہو گا۔ اسی طرح نماز اور دیگر نیکیوں میں چستی کرنی چاہیئے۔ جس طرح نوٹ اٹھانے والے نے کی تھی۔ کیونکہ یہ ہمارا اپنا فائدہ ہے۔ فرمایا کہ عقلمند تو سستی نہ کرے گا۔ مگر پھر بھی حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے طریقہ بتلا دیا ہے۔

مثال۔ دیکھو اگر ٹھیکہ پر کام نہو بلکہ یومیہ مزدوری پر ہو تو اگر مالک موجود رہے تو مزدور چستی سے کام کرتا ہے۔ اور اگر

مالک موجود نہو تو سستی کرتا ہے۔

تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دونوں طریقے فرما دیے ہیں کہ اگر میں اسے نہیں دیکھ رہا وہ تو مجھے دیکھ رہا ہے۔ یا تو اس طرح نیکی کرو کہ میں اللہ تعالےٰ کو دیکھ رہا ہوں ورنہ تو یہ خیال رکھو کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

درس نمبر۲۰
18 نومبر 1966ء

حَسَد

اس سے پہلے درسوں میں منافقوں کے اخلاق کے سلسلہ میں دو کا بیان گزر چکا ہے۔ 1۔ظاہر اور باطن کا اختلاف۔ 2۔ اللہ تعالیٰ اور مومنوں کو دھوکہ دینا۔ اللہ تعالےٰ کو دھوکہ دینے کا مطلب یہ کہ، دھوکہ باز جیسی چالبازی کرے۔ ویسے تو اللہ تعالےٰ کو کون دھوکہ دے سکتا ہے۔ 3۔ منافقوں کی تیسری خصلت۔ فی قلوبہم مرض فزادھم اللہ مرضا۔ ان کے دلوں میں ایک روگ اور بیماری ہے اور یہ نکلے گی نہیں بلکہ اللہ اور بڑھائیگا۔ ان کو درد ناک عذاب ہے۔ اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔

تو تیسری خصلت حسد علی المسلمین ہوئی۔ کہ مسلمان کی ترقی و نعمت اور مسلمان کو فائدہ پہنچے تو منافق جلتا ہے۔ کیونکہ مدینہ منورہ میں ایک صحابہ کرامؓ کی جماعت تھی اور دوسری عبداللہ بن ابی کی جماعت تھی۔ اللہ تعالےٰ نے ان منافقین کے دل کا حال بتلا دیا کہ ان کے دل میں مسلمانوں کا بغض ہے۔

اگر ان مسلمانوں کو تکلیف و مصیبت پہنچے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر سکھ و خوشی پہنچے تو غمگین ہوتے ہیں۔ آج ہم اپنے آپ کو تولیں کہ ہم کس گروہ میں ہیں۔ جس طرح منافقین مسلمانوں کی غمی پر خوش اور خوشی پر غمگین ہوتے تھے۔ کیا آج ہم اس طرح نہیں ہیں؟ اور پھر اسے مرض کہا گیا ہے۔ یہ ہسپتالی مرض نہیں یہ تو دینی اور روحانی مرض ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک اور چیز ہے۔ (غبطہ) اگر مسلمانوں کو نعمت نصیب ہو۔ مثلاً علم یا بدن کی تندرستی یا عزت وغیرہ تو یہ منافق حسد کرتے ہیں۔

اگر ایک آدمی یہ آرزو کرے کہ اسے بھی دے اور مجھے بھی دے۔ یہ غبطہ کہلاتا ہے۔ یہ جائز ہے۔ کیونکہ مسلمان کے ساتھ کوئی بدی یا برائی کا ارادہ نہیں۔

دوسری صورت یہ کہ یا اللہ یہ نعمت اس سے چھین لو۔ مجھے چاہے دو یا نہ دو۔ اسے حسد کہتے ہیں۔ یہ منافقین کی تیسری خصلت ہوئی۔ جسے مرض کہا گیا ہے۔ فرمایا کہ اللہ اس مرض کو اور بڑھائے گا۔ حسد نعمت کے مقابلہ میں ہے۔ تو اللہ تعالےٰ جوں جوں مسلمانوں کی نعمت بڑھائیگا ویسے ہی ان کی مرض بڑھے گی۔ بیمار انسان تو چاہتا ہے کہ مرض سے شفا ہو۔ مرض ختم ہو۔ لیکن حاسد کی مرض روزانہ بڑھے گی۔ اس مرض کا انجام آخرت اور دنیا دونوں میں ہوگا۔ ولہم عذاب الیم۔ دردناک عذاب آخرت کا

ہے۔اور دنیا میں جلنا عذاب ہے۔ کیونکہ حاسد جلتا رہتا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے ہاں گاؤں کے دو ناخواندہ بوڑھے آئے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ ایک نے کہا کہ میاں مسلمان تو تباہ ہوگئے اور یہ کب ترقی کریں گے۔ تو دوسرے نے کہا کہ مسلمان ایک ہو اور نیک ہو۔ میں نے کہا کہ یہ تو الہامی فقرہ ہے۔ اسے تو بڑا عالم بھی ادا نہ کر سکتا تھا۔

اقبال:۔

اے شیخ بہت اچھی کالج کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقیؓ و عثمانیؓ

کہ حضرت فاروق اعظمؓ و حضرت عثمانؓ وغیرہ کالج سے نہ بنے تھے۔ بلکہ بیاباں سے بنے تھے۔ یورپ اور امریکہ کا فیصلہ ہے کہ اگر مسلمان ایک ہوگئے تو عیسائی ختم ہو جائیں گے۔ عرب ایک ہو جائیں تو عجم بھی ایک ہو جائیں گے۔ پہلے بھی اسی طرح ہوا تھا کہ جب عرب ایک ہوگئے تھے تو پورے عجم کو فتح کر لیا تھا۔ مگر آج کل صدر ناصر شاہ سعود سے نہیں ملنا چاہتا وغیرہ۔

سوال یہ کہ ایک کیوں نہیں ہوتے۔ صرف حسد کی وجہ سے ایک نہیں ہوتے۔ آدمی اگر مسلمان کی نعمت پر خوش ہو

جائے تو حسد ختم ہوجاتا ہے۔ اور اختلاف بھی ختم۔ لیکن یہ مرض بہت بڑھ گیا ہے۔ اور یہ حسد علماء میں بہت ہے۔ قیامت میں حاسدین کو علیحدہ ہو جانے کا اعلان ہو گا۔ حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ سے مروی ہے لاتصدق علماء بعضہم علی بعض تشاحُن بینہم۔ اگر کسی کا مولوی کے خلاف کیس ہو اور اس کے گواہ بھی مولوی ہوں تو ان گواہوں کو صیح نہ سمجھو کیونکہ مولوی ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں۔ حدیث پاک جو خاص حسد کے لئے ہے۔ ان الحسد یاکل الحسنات۔ کہ حسد انسان کی نیکیوں کو کھا جاتا ہے۔ کماتا کل النار الحطب۔ جس طرح آگ لکڑی کو جلاتی ہے۔ حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں کچھ تفصیل سے ذکر کیا ہے مگر میں مختصر بیان کرونگا۔ دو چیزیں ذکر کروں گا۔ 1۔ ایک ہے حاسد۔ 2۔ دوسرا ہے محسود۔ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو آدمی کسی مسلمان کی نعمت و ترقی کو پسند نہیں کرتا۔ اور یہ خواہش کرتا ہے کہ یہ چیزیں اس کو نہ ملیں۔ اسے حاسد کہتے ہیں تو حاسد پہلے یہ سوچ لے کہ اسے اس کام میں فائدہ بھی ہے کہ نہیں۔ تو فائدہ یا آخرت کا یا دنیا کا ہوگا۔ ولھم عذاب الیم ۔ آخرت میں تو دردناک عذاب ہے۔ دیکھو دنیا کی کسی تکلیف کو دردناک نہیں کہا گیا۔ یہ تو آخرت کا نقصان ہوا۔ باقی رہا دنیا کا معاملہ تو حضرت امام غزالی فرماتے ہیں کہ دنیا میں بھی سراسر نقصان ہے۔ مثلاً کسی کی زیادہ

تنخواہ دیکھ کر حاسد جلتا ہے۔ کیا اس کے جلنے سے اسکی نعمت میں کمی ہوگی! ہر گز نہیں۔ بلکہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اللہ تعالےٰ کو غصہ آئے وہ اس کی نعمت اور زیادہ کر دے اور تو جلتا رہے۔ تو یہ دنیا کا عذاب نہ ہوا؟ تو محسود کو کوئی ضرر نہیں ہوا مگر حاسد آگ میں جلتا رہا۔ اس کے بعد حاسد کا بڑا ضرر یہ ہے کہ حاسد خدا تعالےٰ کو پسند نہیں۔ کیونکہ حضور نبی کرم صلے اللہ علیہ وسلم کو جو دعائیں سکھائی گئی ہیں اس میں ایک دعا یہ ہے۔ ومن شر حاسد اذا حسد۔ کہ یا اللہ مجھے حاسد کے حسد سے محفوظ فرما۔ آپ جس کے حسد سے پناہ مانگتے ہوں۔ کیا وہ آپ کا دوست ہوگا؟ وہ تو اللہ و رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا دشمن ہوگا۔

حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حسد کی حقیقت اعتراض علی تقسیم اللہ ہے۔ کہ اے اللہ تعالےٰ تیری تقسیم غلط ہے۔ وما بکم من نعمتہ فمن اللہ۔ کہ ہر نعمت اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہے۔ مگر حاسد نعمت کی تقسیم پر خوش نہیں۔ تو گویا اللہ تعالےٰ پر اعترض ہوا۔ کہ یا اللہ۔ فلاں شخص کو نعمت دیکر معاذاللہ تو نے اچھا کام نہیں کیا۔ اور اللہ تعالےٰ سے بڑھ کر تو کوئی حکیم و دانا نہیں۔ انسان کی سمجھ بوجھ اور خدا تعالیٰ کی سمجھ بوجھ میں تو بڑا فرق ہے۔ فزادھم اللہ مرضا۔ پھر حسد کے مرض میں روزانہ اضافہ ہوتا ہے۔ یہ مزید نقصان ہوا۔ تو پھر ایسے مرض کو کیوں اختیار کریں

اسے چھوڑ کیوں نہ دیں جس نے دور نہیں ہونا۔ ختم نہیں ہونا۔ بلکہ بڑھنا ہے۔ اسی لئے اسے آج ہی ختم کر دیں۔ اگر مسلمان حسد کو ختم کر دے تو پوری دنیا پر چھا جائے۔ کیونکہ حسد ہی اختلاف کی بنیاد ہے۔ باقی حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کا فرمایا ہوا جواب مختصر بیان کرتا ہوں۔ فرمایا جب کسی کو حسد کی بیماری لاحق ہو جائے تو پہلے بارگاہ الٰہی میں توبہ کرے کہ یااللہ میرے قلب کی اس سیاہی کو دھو ڈال۔ پھر علاج بالضد ہوتا ہے۔ تو جس شخص کے لئے حسد پیدا ہوا ہے اسکی ترقی کیلئے دن رات دعا کرے۔ کہ یا اللہ اس شخص کی نعمت کو اور بڑھا دو۔ تاکہ شیطان خبیث کا منہ کالا ہو جائے ۔ کہ تو مجھے جلا رہا ہے اور میں اسکی ترقی کیلئے دعا کر رہا ہوں۔ اور دوسری بات یہ کہ ملنے کے وقت اس کا جوتا جوڑے تاکہ تواضع پیدا ہو۔ جب تواضع پیدا ہو جائیگی تو ظاہر و باطن دونوں درست ہو جائیں گے۔ تو فرماتے ہیں کہ چند دن بعد مرض دور ہو جائیگی ۔ اور جو مریض اپنے مرض کو مرض تصور نہ کرے بلکہ تندرستی سمجھے تو اس کا علاج ہی نہیں۔

درس نمبر ۲۱
20 نومبر 1991ء

تشریح فساد و اصلاح

آج منافقین کی چوتھی خصلت کا بیان ہے۔ 4۔ فساد کو اصلاح سمجھتے ہیں جب منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ تم زمین اور ملک میں فساد نہ کرو۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو فساد نہیں کرتے بلکہ ہم تو اصلاح کرتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خوب سن لو یہی فسادی ہیں مگر انہیں علم نہیں۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ منافق بگاڑنے کو سدھارنا کہتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ مومنوں کو اس مرض سے بچائے۔

حضرت امام راغب رحمۃ اللہ علیہ۔ فساد و اصلاح کی تشریح فرماتے ہیں۔ جو کام اعتدال اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو اسے فساد کہتے ہیں۔ اور جو اعتدال اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہو اسے اصلاح کہتے ہیں۔ تو فسادِ عقل یعنی دماغ کی خرابی کیوجہ سے منافق فساد کو اصلاح سمجھتے تھے۔ جیسے صفرا کے غلبہ سے میٹھی چیز تلخ معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح چونکہ منافقوں کی عقل بگڑی ہوئی ہے وہ بھی فساد و اصلاح کی تمیز نہیں کر سکتے۔ تو اللہ تعالےٰ نے حکم

لگا دیا کہ یہ لوگ غلطی پر ہیں۔ اور یہی لوگ ہی زمین پر فساد کرنے والے ہیں۔

منافق کیا فساد کرتے ہیں تاکہ ہم اس سے بچ جائیں۔

(1) واذا کانوا فیکم مازادوکم الاخبالا۔ اگر یہ منافق تمہاری جماعت میں رہتے ہیں تو بگاڑ کرتے رہیں گے۔ معلوم ہو گیا کہ منافقوں کا ایک فساد مسلمانوں کو آپس میں لڑانا تھا۔ تو جو مسلمانوں کو آپس میں لڑائے یا فتنہ ڈالے اس نے منافقانہ فطرت پر عمل کیا۔

(2) وفیکم سمعون لھم۔ کہ تمہارے راز سن کر دشمنوں کو پہنچاتے ہیں۔ آج اس خصلت میں تقریباً بہت سے علماء مشغول ہیں۔ مثلاً انگریز کے دور میں سی، آئی، ڈی خفیہ پولیس میں مسلمان تھے۔ اسے اسلام میں چغلی کہتے ہیں۔ تو یہ بات خود قرآن نے بیان کی کہ وہ مسلمانوں کے راز دشمنوں تک پہنچاتے ہیں۔ تو چغل خور کے بارے میں حدیث پاک ہے لا یدخل الجنۃ قتات۔ کہ چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔ جو اسلامی حکومت کے راز کفار کو بتلائے وہ چغل خور نہیں؟ کبھی کبھی انسان غلطی سے غیبت کر لیتا ہے۔ لیکن اگر اخلاص سے توبہ کر لے تو اللہ تعالےٰ معاف کر دیتا ہے۔ دو واقعے ذکر کرتا ہوں۔ ان سے اندازہ قائم کریں گے۔ یہ واقعے مواہب الدینہ سے نقل کرتا ہوں۔ بنو قریظہ یہودیوں کا قبیلہ تھا۔

5ھ میں اس قبیلے نے لشکر اسلام کو مٹانے کیلئے ایک تدبیر کی۔ تو واقعہ یوں ہے کہ کفار کے بارہ ہزار مرد حملہ آور ہوئے۔ تو یہود سے یہ شرط طے تھی کہ اگر تم پر کوئی حملہ آور ہوا تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اور اگر ہم پر کوئی حملہ آور ہوا تو تم ہماری امداد کرنا۔ مگر یہ یہود کفار مکہ سے مل گئے۔ شدید سردی کا موسم تھا۔ پہلے تو اللہ تعالےٰ نے امتحان لیا پھر اللہ تعالےٰ نے سخت آندھی کی صورت میں امداد فرمائی۔

قرآن:۔ اذجاؤکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذزاغت الابصار و بلغتہ القلوب الحناجر و تظنون باللہ الظنونا۔ یعنی پوری طرح لشکر آیا اور منافقوں کو گمان تھا کہ اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو ایسے ہی چھوڑ دے گا۔ وکان اللہ قویاً عزیزاً کہ اللہ تعالےٰ غالب بھی ہے اور طاقتور بھی ہے۔ مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ بعد فراغت جنگ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہا رہے تھے۔ کہ جبرائیل علیہ السلام آگئے عرض کی کہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ جنگ ختم تو نہیں ہوئی۔ تم یہود سے جنگ لڑو کیونکہ انہوں نے معائدہ توڑا ہے۔ تو حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ عصر کی نماز یہود کے پاس جا کر پڑھیں گے۔ جب آپ بمع لشکر تشریف لے گئے تو وہ قلعہ میں محصور تھے۔ 25 دن محاصرہ رہا۔

کعب ابن سعد یہود کا سردار تھا اس نے اپنی قوم کو

خطاب کیا اے یہود دیکھو توراۃ کے حوالے سے یہ نبی برحق ہے۔ تو یا تمہیں یہودی مذہب چھوڑنا پڑے گا۔ قوم نے کہا یہ نہیں کر سکتے۔ 2۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنی عورتیں اور بچے قتل کر کے میدان میں آجاؤ۔ انہوں نے کہا یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ 3۔ تیسری بات یہ کہ پھر توراۃ کے فیصلے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ وہ یہ تھا کہ جو قوم جنگی معائدہ توڑدے اسے قتل کر دو۔

تو 25 دن بعد انہوں نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا ۔ اور کہا کہ ہمیں ابولبابہؓ انصاری سے مشورہ کرنے دو پھر عرض کریں گے۔ جب حضرت ابو لبابہؓ پہنچے تو عورتیں اور بچے چیخنے لگے۔ تو انہوں نے کہا کہ اگر ہم آپ کے حوالے ہو جائیں تو پھر کیا فیصلہ ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ بالغ مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ کیونکہ انہوں نے جنگی معائدہ توڑا ہے۔ تو حضرت لبابہؓ نے منہ سے تو کوئی جواب نہ دیا صرف اپنی انگلی اپنے گلے پر پھیر کر اشارہ کر دیا کہ قتل کیا جائے گا۔

تو حضرت ابولبابہؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے انگلی سے اشارہ کر کے اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا راز افشاء کیا تو میرا پورا بدن شرم کی وجہ سے پگھلنے لگا۔ جب یہ صحابی مدینہ میں آئے تو اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستون سے باندھ دیا۔ دیکھو ہم سینکڑوں گناہ کرتے ہیں مگر توبہ کا خیال ہی

نہیں۔ جب یہ بات حضور پاک صلے اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا بندہ خدا اگر میرے پاس چلا آتا تو میں معاف کر دیتا۔ مگر اب اس نے دوسرا فیصلہ لیا۔ یعنی اللہ پر معاملہ چھوڑا۔ اب وہ جانے۔ مواہب لدنیہ والے لکھتے ہیں کہ ابو لبابہ رضؓ نے ایک آدمی مقرر کر رکھا تھا جو قضائے حاجت اور نماز کے وقت رسی کھول دیتا اور پھر باندھ دیتا۔ اسیطرح بیس (20) دن بندھے رہے۔ نہ کھانا نہ پینا نہ نیند کی۔ حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم بیس دن خاموش رہے۔ آخر قرآن کی آیت نازل ہوئی۔ یاایھاالذین امنو لا تخونو اللہ ورسولہ ولا تخونوا اما نتکم۔ تم اللہ ورسول اور اپنے نفس کی خیانت نہ کیا کرو۔ عسی اللہ ان یتوب علیکم۔ شاید کہ اللہ تعالےٰ ان کی توبہ قبول کر لے۔ تو آپ نے فرمایا کسی کو بھیج دو اسے کہے کہ اللہ تعالےٰ نے تمہاری غلطی معاف کر دی ہے۔ تو انہیں بشارت سنائی گئی اور ایک صحابیؓ ان کی رسی کھولنے لگے تو ابو لبابہ رضؓ نے کہا کہ جب تک حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم رسی نہ کھولیں گے میں کسی کو نہیں کھولنے دونگا۔ تو آپ تشریف لائے اور اپنے دست مبارک سے رسی کھولی۔ آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ ایک مسلمان منافقانہ خصلت سے بچنے کی کتنی کوشش کرتا تھا۔ بنو قریظہ کو اوس کے قبیلہ سے دوستی تھی۔ جن کے سردار حضرت سعد ابن رضؓ معاذ تھے۔ یہ صحابی جنگِ خندق میں زخمی ہوگئے۔ تو آپ نے طبع پرسی کے لیئے خیمہ لگوایا ہوا

تھا۔ آپ کی دعا تھی کہ یا اللہ میں زخمی ہو گیا ہوں اگر تیرے علم میں ہے کہ ہم نے قریش سے اور جنگ لڑنی ہے تو میرا زخم درست کر دو تاکہ میں دوسری جنگوں میں لڑوں۔ اور اگر قریش سے دوسری جنگ نہیں ہونی تو پھر مجھے اسی زخم سے شہادت دیدو۔ تو اسکے بعد قریش مکہ سے کوئی جنگ نہوئی اور مکہ فتح ہو گیا۔ تو حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہارا فیصلہ یہ حضرت سعد ابنؓ معاذ کر دیں۔ یہود خوش ہو گئے کہ یہ تو ہمارا دوست ہے اور اچھا فیصلہ کرے گا اور انہوں نے ان کے فیصلے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ حضرت سعد ابنؓ معاذ گھوڑے پر سوار ہو کر جائے فیصلہ پر پہنچے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اب اسلام پر سب دوستیاں ختم کرتا ہوں۔ لقد حکمت بحکم الملک۔ اس فیصلہ کے بعد آپ کا وہ زخم جاری ہو گیا اور چند دنوں بعد آپ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

لقد اهتز عرش الرحمن۔ جب ملائکہ اس صحابیؓ کی روح مبارک کو عالم بالا کی طرف لیجانے لگے تو اللہ تعالےٰ کا عرش مبارک خوشی سے ہلنے لگا۔ یعنی جھومنے لگا۔ اور کبھی نہیں جھوما۔ حضور پاک صلےٰ اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک ہے کہ ان کے جنازہ میں ایسے ستر (۷۰) ہزار ملائکہ نے شرکت کی تھی جو کبھی بھی زمین پر نہیں اترے تھے۔

دوسرا واقعہ حضرت حاطب بن ابیؓ بلتعہ کا ہے۔

6ھ میں کفار مکہ اور حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مابین ایک معائدہ ہوا۔ کفار نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک قبیلے کے فرد کو قتل کر دیا۔ مقتول کے قبیلے کے چالیس آدمی حضور کریم صلےٰ اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا کہ وعدہ کے مطابق ہماری امداد کریں۔ طبری میں مذکور ہے کہ حضرت حاطب بن ابیؓ بلتعتہ صحابی نے عکرمہ بن ابی جہل کو خط لکھا کہ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک ایسی فوج کے ساتھ مکہ آنے والے ہیں جس کے سامنے تم نہیں ٹھہر سکتے۔ اور مجھے خدا کی قسم ہے کہ اگر ان کے ساتھ کوئی ایک سپاہی بھی نہو تو پھر بھی اللہ انہیں فتح دیگا۔ یہ خط ایک عورت کو دیکر روانہ کیا اس نے اپنے سر میں خط چھپا رکھا تھا۔ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ اطلاع ملی کے راز افشا ہو گیا ہے۔

حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ۔ حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ کو روانہ فرمایا اور فرمایا کہ روضہ کاخ کے مقام پر ایک عورت ملیگی اس کے پاس خط ہو گا وہ اس سے لے آؤ وہاں پہنچے تو عورت ملی اس نے خط کا انکار کیا۔ مگر حضرت علیؓ نے فرمایا قسم بخدا پیغمبر علیہم السلام کی بات غلط نہیں ہوتی۔ آخر کار اس نے خط نکال دیا۔

خط میں اس صحابیؓ کے دستخط تھے۔ آپ نے مجمع

عام میں بلا کر فرمایا یہ کیا کیا؟ عرض کی یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ جلدی نہ فرمائیں میری عرض سنیں۔ میں نے یہ خط مرتد ہو کر تو نہیں لکھا۔ چونکہ میرا مال مکہ میں ہے۔ اور میں مسافر ہوں مکہ میں میرا کوئی رشتہ دار نہیں باقی سب صحابیوںؓ کے رشتہ دار ہیں اس خط کی وجہ سے میرے مال کی حفاظت ہو جائیگی۔ باقی فتح تو آپ کو ہونی ہی ہے۔

اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے اجازت دو کہ میں اسے قتل کردوں۔ حدیث پاک میں ہے اعملوا ما شئتم فقد غفر تم لکم آپ نے فرمایا یہ جنگ بدر میں شریک تھا اور اصحاب بدریین کیلئے خداتعالےٰ کا حکم ہے کہ تم جاہو جو کچھ کرو توبہ ہو گئی۔ اور اسکا عذر بھی معقول ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ منافقوں کی یہ خصلت ہے کہ وہ فساد کو اصلاح سمجھتے ہیں۔

آج کل اسلامی سلطنتیں مختلف ملکوں میں اصلاحات نافذ کر رہی ہیں ان میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو خداتعالیٰ کے حکم کے خلاف اور منافقوں کے مطابق ہیں۔ یہ مرض مسلمانوں میں بہت عام ہو گیا ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ میں نے ایران میں اپنے دوست سے کہا کہ فلاں جگہ میرے ساتھ چلو تو اس نے کہا۔ اصلاحِ ریش خود کردم آیم۔ کہ میں اپنی داہڑی کو درست کر کے آتا ہوں۔ یعنی داہڑی منڈوانے کو درستگی اور اصلاح کہہ رہا ہے۔ تو

معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں نے فساد کو اصلاح بنا لیا۔

خلاف شرع جشن۔ سینما۔ اور ثقافتی میلوں کو آج کل حکومتیں اصلاح میں داخل کر رہی ہیں۔ حالانکہ انہیں دیکھنا چاہیے کہ جو طور طریقے ہم اپنا رہے ہیں یہ طریقے یہ خصلتیں منافقوں والے تو نہیں؟ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے تو انہیں ہم المفسدون کہا ہے۔ مثلاً ایک آدمی عورت کے حقوق کے متعلق اصلاح کردے کہ عورت آزادانہ بغیر پردہ کے گھوما پھرا کرے۔ یہ تو فساد ہے اصلاح تو نہیں۔ دیکھو امہات المومنین رضوان اللہ تعالےٰ عنہن اجمعین۔ جو کہ پاک تھیں انہیں حکم ولا تبرجن تبرج الجاہلیۃ الاولیٰ۔ کہ پہلی جہالت کے زمانے کی طرح نہ پھرا کرو۔ میں لفظ اولیٰ پر حیران تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ کیونکہ اولیٰ دلیل ہے آخری کی۔ مثلاً پہلی گاڑی آگئی ہے یہ دلیل ہے کہ دوسری بھی آئیگی۔ تو آخر مطلب سمجھ میں آیا۔ کہ پہلی جہالت وہ جو اسلام سے پہلے تھی اور جہالت ثانیہ جو اللہ تعالےٰ کے علم میں تھی۔ کہ بیسویں صدی میں مغربی تہذیب کیوجہ سے آئیگی۔

امہات المومنین کو تو پردہ کا حکم ہو۔ مگر آج بیسویں صدی میں بے پردگی کو حقوق نسواں کہا جا رہا ہے۔ آج سے بیس سال پہلے حج کے موقعہ پر تقریباً ساٹھ علماء تھے۔ ان میں ایک مولوی محمد ایوب کابلی بھی تھے۔ انہوں نے کہا لا تحب المرۃ الا۔ کہ ہم تو

نامرد بن گئے کہ ہمارے لئے عورت اور دیوار ایک برابر ہے۔ میں نے کہا کہ یہ حرمین شریفین کی برکت ہے کہ یہاں تو بروں کے دل بھی درست ہو جاتے ہیں۔ مگر اس نیک موقعہ پر بھی عورت کو غیر محرم کیساتھ جانا منع ہے۔ مگر آج تو عورتیں کالج میں اکیلی جاتی ہیں اور مری کی سیر و تفریح پر جاتی ہیں۔ مولانا عبد الخالق رحمۃ اللہ علیہ جو جامعہ عباسیہ میں شیخ الحدیث بھی تھے۔ وہ آخری وقت میں رونے لگے کہ میں تو ایک نئی جگہ پر جا رہا ہوں اب تو مجھے اپنی نیکیاں بھی گناہ نظر آرہے ہیں۔ آج تو عورتوں سے ہاتھ ملائے جا رہے ہیں۔ مگر حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ فرماتی ہیں کہ قسم ہے کہ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ مبارک کسی عورت کے ہاتھ سے نہ چھوا۔

میری ایک بچی بہت نیک ہے اس نے خواب دیکھا ہے کہ ایک نورانی شخص آیا ہے۔ اس نے کہا کہ چپ رہو میں کچھ باتیں بتاتا ہوں۔ کہ قیامت بالکل قریب ہے۔ اور ایک شخص دکھایا کہا کہ یہ حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور آسمان مکمل باغ تھا کہا کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے۔

تو میں نے تعبیر بتلائی کہ قیامت بالکل قریب ہے۔ اب دنیا ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے کہ دنیا کی مجموعی عمر کم رہ گئی ہے۔ اور خود اپنی عمر کا بھی کوئی پتہ نہیں کہ کس وقت ختم ہو جائے۔

درس نمبر ۲۲
27 نومبر 1966ء

تحمیقُ المقبُولین

آج منافقوں کی پانچویں خصلت کا بیان ہے۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اصحابِ کرامؓ جیسا ایمان لاؤ جواب دیتے ہیں۔ کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا بیوقوف لائے ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں سن لو یہی منافق بیوقوف ہیں۔

تحمیق المقبولین:۔ کہ اللہ تعالےٰ کے نیک بندوں کو اور اللہ کے مقبولین اور صیحح عقلمند انسانوں کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ اللہ نے جواب دیا کہ معاملہ الٹا ہے۔ کہ جنہیں بیوقوف سمجھتے ہیں وہ عقلمند ہیں اور یہ خود بیوقوف ہیں۔ اب حل طلب بات یہ ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ کو کیوں بیوقوف سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو کیوں عقلمند کہا اور انہیں بیوقوف کہا۔

منافق، صحابہ کرامؓ کو اس لئے بیوقوف کہتے تھے کہ وہ پرلے درجے کے دنیا پرست تھے۔ اور صحابہ کرامؓ دنیا سے متنفر تھے۔ یعنی وہ صحابہ کرامؓ فوری فوائد کو آنیوالے فوائد پر قربان

کرتے تھے۔ یعنی فوائد عاجلہ کو فوائد آجلہ پر قربان کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے دلوں میں یہ بات بٹھائی تھی کہ تمہاری سب قربانیوں کا اجر آخرت میں ملے گا۔ وطن چھوڑنا معمولی بات نہیں اور پھر مکہ شریف جیسے وطن کو چھوڑا۔ جہاں کی ایک نماز لاکھ نمازوں سے بہتر اور ایک روپیہ کی خیرات لاکھ روپیہ کی خیرات سے بہتر ہے۔ یعنی اس دنیا کے سب فوائد قربان کئے۔ یہ اس امید پر کہ آخرت میں زیادہ فائدہ ہوگا۔ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان منافقین کا خیال تھا کہ جو چیز فوری ہاتھ لگے وہ آخرت میں ملنے والی چیزوں سے بہتر ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ ان کی بیوقوفی تھی۔ اور اللہ تعالےٰ نے صحابہ کرامؓ کو اس لئے عقلمند فرمایا کہ یہ فوری فوائد کو آخرت کے فوائد پر قربان کرتے ہیں۔ آج کل دین کو دنیا پر قربان کیا جارہا ہے۔ دنیا کے فائدے ہاتھوں ہاتھ میں اور آخرت کے فائدے دور ہیں۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ قاعدہ غلط ہے۔ اتنی بات صحیح ہے کہ فوری فائدہ آنیوالے فائدے سے بہتر ہے۔ بشرطیکہ دونوں برابر ہوں۔ مثلاً ایک آدمی آج ایک روپیہ دے اور دوسرا سال بعد وہی ایک روپیہ دے تو یہ برابر ہے۔ لیکن اگر آج ایک روپیہ کا فائدہ ہو اور آئندہ ملنے والا روپیہ آج سے کروڑوں گنا زیادہ ملے تو وہ بیوقوف ہی ہوگا جو آج ایک روپیہ نقد لے

لے اور آئندہ ملنے والے کروڑ روپے کو نظر انداز کردے۔ کسان جب گندم کی کاشت کرتا ہے تو ایک ایکڑ زمین میں کچھ گندم کی تھوڑی سی مقدار تخم کے طور پر ڈال کر ضائع کر دیتا ہے۔ کیونکہ صاف ستھرے دانے کو مٹی میں ڈال کر ضائع کردیا اور کھو دیا۔ اس لئے کہ آنیوالا فائدہ زیادہ ہے۔ اس نے فوری فائدہ آنیوالے فائدے پر قربان کردیا۔

صحیح معنی میں علم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے جوڑے۔ یہ دنیاوی علوم تو روزگار کیلئے ہیں ان کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ انسان کو کمانا اور خوب کمانا چاہیئے مگر دنیاوی کمائی کو ثانوی حیثیت دینی چاہیئے۔

حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے خواب میں بہشت میں انگور کا خوشہ دیکھا پوچھا یہ کس کیلئے ہے کہا گیا یہ ابوجہل کیلئے ہے۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ اس کیلئے کیسے ہو سکتا ہے۔ بعد میں جب حضرت عکرمہ بن ابی جہل مسلمان ہوئے تو میرے خواب کی تعبیر مکمل ہو گئی۔

دنیاوی تعلیم حاصل کرنے کیلئے ہزاروں دام خرچ کرتے ہیں اور عمر بھی صرف کرتے ہیں یہ اس لئے کہ فی الحال کا فائدہ آئندہ کے فائدے پر قربان کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت کا واحد مالک ہے اور وہ خود ہی فرماتا ہے کہ آخرت دنیا سے

بہتر ہے۔

حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہشت میں چابک جتنا ٹکڑا دنیا و آسمان کی سب نعمتوں سے افضل ہے اور پائدار بھی ایسا کہ زوال نہیں۔ ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفسوں اور مالوں کو آخرت کے بدلے خرید لیا ہے۔ اس تجارت پر خوشی مناؤ کہ درحقیقت ہمارا نفس و مال سب خدا تعالیٰ کا ہے پھر بھی وہ خریدتا ہے۔ یعنی اس نے ہم سے اپنی چیز بہت عظیم بدلہ کے عوض لی۔

عقل کے معیار سے دیکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کو بیوقوف کہا اور مسلمانوں کو عقلمند۔ حالانکہ منافق کہتے ہیں کہ ہم عقلمند ہیں اور مومن بیوقوف ۔ ایک آدمی کتنا ہی بیوقوف ہو وہ اپنے آپ کو کبھی بیوقوف نہیں کہیگا۔

اس سلسلہ میں پہلا فیصلہ خدا کا ہوگا اور دوسرا فیصلہ خود عقل کرے گا۔

خدائی فیصلہ:۔ آسمان دنیا کی پیدائش، اور دن رات کا ایک دوسرے کے بعد آنا عقلمندوں کیلئے دلائل ہیں۔ ہم امریکہ کو عقلمند سمجھتے ہیں، مگر عقلمند اسے کہتے ہیں جو ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرے، کھڑے، بیٹھے اور لیٹے وغیرہ۔ اور آسمان و

زمین کی تخلیق میں سوچتے ہیں کہ یا اللہ، سبحان اللہ، تونے یہ کارخانہ باطل نہیں بنایا۔ ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقلمند وہ ہے جو ذکر اللہ کرے۔ اور فکر کرے کہ دنیا میں میری پیدائش کا کیا سبب ہے میں دنیا میں کس لئے آیا ہوں بڑے بڑے بزرگ روتے تھے کہ یا اللہ بہشت میں نیک لوگوں کی جوتیوں میں جگہ دیدو کیونکہ دوزخ کی آگ کی تاب نہیں۔ دنیا میں سب سوئے ہوئے ہیں۔ جاگ اس وقت ہوگی جب آخرت آئیگی۔ تو دنیا میں آخرت کی نجات کے اسباب کرنے چاہیں۔ معاش دنیا تو جانور کو بھی نصیب ہے۔ علماء حیوانات لکھتے ہیں کہ چیونٹی اپنے پورے سال کا خرچ جمع کر لیتی ہے۔ (عنکبوت) مکڑی جالا بنتی ہے کہ مکھی آئے تو فوراً پکڑلوں۔ تحقیق کی گئی ہے کہ بعض پرندوں کی خوراک سمندری مچھلیاں وغیرہ ہیں۔ جو سطح سمندر پر اڑتے رہتے ہیں جب جانور پانی سے اوپر اچھلتا ہے تو وہ پکڑ لیتے ہیں۔ اور بعض سمندری جانور اڑنے والے پرندے پکڑتے ہیں۔ تو ان دونوں کو خوراک یا روزی مل رہی ہے۔ مگر انسان روزی کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔

فکر دنیا و فکر عقبیٰ کا بیان ہے۔ حدیث شریف میں اس کی یوں تعریف کی گئی ہے کہ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہوشیار وہ ہے جس کا نفس خدا تعالیٰ کے تابع ہو اور آنیوالے جہان کیلئے کوشش کرتا ہو۔ اور بیوقوف اور غافل وہ ہے

جس نے نفس کو دنیاوی خواہشات کے تابع کر دیا اور اللہ تعالیٰ سے آخرت میں نجات کی امید رکھی۔

دراصل یہ انسانیت اور غیر انسانیت میں فرق ہے۔ اگر جانور بھوکا ہو سامنے کھیتی آجائے وہ بھاگ کر کھانا شروع کر دیگا۔ خواہ وہ اس کے مالک کی ہو یا کسی غیر کی۔ مگر انسان اگر رمضان شریف میں روزہ کی حالت میں ہو تو وہ اپنے سامنے شربت اور خوراک پا کر متوجہ نہیں ہو گا۔ اگر ڈاکٹر نے مریض کو پرہیز کہا تو وہ پرہیز والی چیز نہیں کھائے گا۔ لیکن جانور کی کوئی پرہیز نہیں۔

ڈاکٹر کی پرہیز سے دنیا کی معمولی تکلیف سے بچ جاؤ گے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے پرہیز پر قائم رہو گے سو دوامی تکلیف سے نجات ہو گی۔ روزہ صرف ہمارے لیے نہیں۔ ہر پیغمبر علیہ السلام اور ہر امت پر فرض رہا ہے۔ صرف چند دن روزے کے ہوتے ہیں۔ ساری عمر نہیں۔ پھر روزہ کا سبب فرمایا کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔ متقی لوگوں کیلئے جنت ہے اور دوزخ حرام ہو جاتی ہے۔

روزہ میں اللہ تعالیٰ کے کہنے پر حلال چیز سے بھی پرہیز کیا۔ مثلاً کھانے، پینے کی اشیاء وغیرہ۔ حالانکہ یہ اشیاء اس پر حلال ہیں مگر روزہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے منع فرمائی ہیں تو وہ ان کو استعمال نہیں کرتا۔ تو اس نے عہد کیا کہ اے اللہ جیسے ہم

نے تیرے کہنے پر یہ سارا مہینہ کھانے پینے سے پرہیز کیا اس طرح ہم سارا سال تیرے فرمائے ہوئے حرام چیزوں سے پرہیز کریں گے۔ کہ رشوت نہیں لیں گے، سود نہیں لیں گے، کسی کا حق نہیں ماریں گے۔

آج کل کی حیوانی ترقی ہے کہ خواہشات کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک گھوڑی اگر کوئی خریدتا ہے تو پہلے اسکی قیمت پوچھتا ہے۔ دینے والا کہتا ہے کہ اس کی صفات بہت ہیں۔ مثلاً دودھ بہت دیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دودھ تو بھنیس وغیرہ کا مطلوب ہوتا ہے۔ اس کی تو رفتار کی ضرورت ہے۔ تو آج کی ترقیِ زمانہ بھی اسی طرح ہے۔ یورپ، امریکہ وغیرہ انسان نہیں مگر انسانی ترقی میں پیچھے نہیں۔ وہ آکل ہیں عاقل نہیں۔

ڈیگال نے پچھلی جنگ میں شکست کا اعتراف کرتے ہوئے صاف کہا تھا کہ ہم نے اس لئے شکست کھائی ہے کہ ہماری قوم میں عیاشی کے رجحان زیادہ ہیں۔ امریکہ میں نوجوانوں کو فوج میں زبردستی بھرتی کیا جا رہا ہے مگر وہ لوگ بھرتی نہیں ہونا چاہتے۔ تحقیق کی گئی کہ کیا سبب ہے تو معلوم ہو گیا کہ عیاشی کا زیادہ اثر ہے جس کی وجہ سے ان کا رجحان جنگ کی طرف نہیں ہوتا۔

انسانی مقصد ضبطِ خواہشات ہوا اور حیوانی مقصد آزادیِ خواہشات ہوا۔

درس نمبر ۲۳
4 دسمبر 1966ء

منافق کی خلوت و جلوت میں فرق

واذا لقوا الذین امنوا الخ۔ منافق جب ایمانداروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ علیحدہ ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو آپکے ساتھ ہیں، ہم نے مومنوں سے تو ہنسی کی ہے۔ اللہ بھی ان سے ہنسی کرے گا۔ یہ عملی خصلتیں مسلمان میں بھی ہو سکتی ہیں۔ مسلمان کو ان سے بچنا چاہئے۔

تو منافقوں کی چھٹی خصلت یہ ہے کہ ان کی خلوت اور جلوت میں فرق ہے۔ کہ مومنوں سے وہ بات کہتے ہیں جن سے مومن خوش ہوں اور منافقوں کیساتھ ان کی پسند کی باتیں کرتے ہیں۔ عربی میں اسے تَلَوُّنْ۔ یعنی دورنگی کہتے ہیں۔ جو شخص خلوت اور جلوت میں اپنی حالت تبدیل کرے تو وہ نفاق میں شمار ہے۔

احیاء العلوم کی جلدِ چہارم میں حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو لوگ حاکموں کے پاس جا کر ان کی بات کی تائید کرتے ہیں اور جب مجلس میں آتے ہیں تو حاکم پر نکتہ چینی

کرتے ہیں۔ کان ھٰذا نفاقاً فی زمان رسول اللہ صلے علیہ وسلم ۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ منافقت شمار ہوئی تھی ۔ آپ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کچھ لوگ حجاج بن یوسف کی ہجو بیان کر رہے تھے کہ ایک صحابیؓ وہاں سے گزرے، فرمایا اگر حجاج اس مجلس میں ہوتے تو تم جب بھی یہ بات کہتے۔ اس نے کہا نہیں۔ تو فرمایا کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانہ میں یہ نفاق تھا۔ حضرت ابن عمرؓ سے آپنے ایک حدیث نقل کی ہے ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر میں مرنے لگوں اور میرے لئے یہ یقین ہو جائے کہ میں مخلص ہو کر مرا ہوں منافق ہو کر نہیں مرا تو میرے لئے یہ ساری دنیا کی بادشاہی سے بہتر ہے۔ یہ ہیں حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ جوان۔

اس کے بنیادی تین اجزاء ہیں اور وہی اللہ تعالےٰ ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ (1) کہ رضائے مخلوق کو رضائے خدا پر ترجیح دینا۔ ترجیح رضاء المخلوق علی الخالق۔ کیونکہ اگر ایک مجلس میں کچھ کہتا ہے اور دوسری مجلس میں دب کر اور کچھ کہتا ہے تو معلوم ہو گیا کہ یہ مخلوق کو خوش کرنا چاہتا ہے۔

(2) اس خصلت سے دوسرا اصول یہ مستنبط ہوتا ہے کہ ترجیح خوف المخلوق علی الخالق کہ مخلوق سے ڈرنا اور خالق سے نہ ڈرنا۔

(3) اتباع ماحول۔ حالانکہ مسلمان انقلابِ ماحول کے لئے

پیدا ہوا ہے۔ اتباعِ ماحول۔ یعنی ارد گرد کے لوگوں سے متاثر ہو کر اثر لینا۔ حالانکہ مسلمان اتباعِ ماحول کیلئے نہیں آیا بلکہ انقلابِ ماحول کیلئے آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان (ناحق) والوں کو تبدیل کرے۔ قرآن نے حق کو نور اور باطل کو ظلمت سے بیان کیا ہے۔ اللہ ولی الذین امنو یخرجھم من الظلمت الی النور۔ نور تاریکی کو بھگانے کیلئے ہے نہ اس لئے کہ نور اندھیرے سے بھاگ جائے۔ بجلی اس لئے روشن کرتے ہیں کہ اندھیرا بھاگ جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق روشنی ہے۔ اور روشنی کا کام ظلمت کو بھگا دینا ہے۔ تو جو شخص بے دینی کی مجلس میں جا کر بے دینی کی باتیں کرے تو یہ ظلمت ہے۔ حالانکہ ان کی اصلاح کرتا تو اس ایک عمل سے مذکورہ بالا تین اصول معلوم ہوتے ہیں۔ منافق کی اور خصلتیں تو چھوڑو یہ دیکھو کہ آج کل مسلمانوں میں یہ تین خصلتیں ہیں کہ نہیں میرا خیال ہے کہ کثرت سے ہیں۔ کچھ عرصہ انگریز کا دور رہا۔ ہم نے اعمال بدلے شکل بدلی الحمدللہ مسلمانوں کا عقیدہ تو محفوظ ہے۔ اور بنیادی چیز بھی یہی ہے۔ عمل اور عقیدہ کی مثال ایسی ہے کہ ایک پھل دار درخت کی اگر ایک یا دو شاخیں خشک ہو جائیں تو زیادہ ڈر نہیں۔ اگر جڑ خشک ہو گئی یا دیمک نے کھایا تو پھر تو اسے درخت نہ کہیں گے۔ اور نہ میوہ کی امید رکھیں گے۔ یہی بعینہ قرآن کا بیان ہے۔ ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء۔

اگر عقیدہ محفوظ ہے تو خوف اور غم کم ہے اور اگر عقیدہ پر ضرب لگ گئی اور نام وغیرہ بھی مسلمانوں کے ہوں اور چند اعمال بھی مسلمانوں کے ہوں تو یہ اس درخت کی مثل ہے جس کی جڑ ختم ہو گئی ہو اور شاخیں موجود ہوں جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ عقیدہ عمل سے بہت اہم اور ضروری ہے۔ لیکن ماحول کا یہ اثر ہوا کہ پہلے عمل بدلے تھے اور اب عقیدے بگڑ رہے ہیں۔ آج رسالوں وغیرہ میں ایسے مضامین آرہے ہیں جن سے ایمان میں شک وشبہات پیدا کئے جا رہے ہیں۔ اور بارگاہ خداوندی میں شک و تردد کی کوئی قیمت نہیں وہاں تو یقین کی قیمت ہے۔ یا تو مسلمانوں کا ایسا پختہ یقین تھا کہ گردن پر تلوار چمک رہی ہوتی تھی تو بھی یقین میں شک پیدا نہ ہوتا تھا۔ اب تو کوئی لالچ نہیں۔ کوئی خوف نہیں اور نہ ہی سر پر تلوار ہے مگر عقیدے بگڑ رہے ہیں۔ حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کبار اولیا میں سے تھے۔ اکثر تو جا چکے اب ہم بھی جانے والے ہیں بقول داغ مرحوم۔

عقل و حواس ہوش و خرد پہلے جا چکے

اب ہم بھی جانیوالے ہیں ساماں تو جاچکا

حضرت انور شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں پوری دنیا کے علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ آج سے پانچ سو سال پہلے

ان کے برابر کا کوئی عالم پیدا نہیں ہوا۔ بالکل چلتی پھرتی لائبریری تھی آپ کو ہر علم کی کتاب یاد تھی۔ مولانا عبدالعزیز صاحب گوجراں والے یہ سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ تھے انہوں نے مجھے اپنا خواب سنایا کہ میں نے خواب میں حضرت انور شاہ کاشمیری رحمتہ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ حضرت کیا حال ہے۔ فرمایا علم ظاہری میں اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ سے کم نہیں رکھا۔ البتہ علم باطنی میں۔ تو اس جملے کا کیا مطلب ہے میں نے کہا کہ علم ظاہری میں کم نہیں رکھا۔ کا مطلب یہ کہ یا تو ان سے زیادہ دیا یا برابر دیا۔ ہمارا بھی یقین ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ سے علم ظاہری میں زیادہ تھے۔ مگر شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ نے ادباً یہ نہیں فرمایا کہ میں زیادہ ہوں۔ اور علم باطنی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے کم تھے۔

حدیث شریف میں ایک خواب ذکر ہے کہ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دودھ خود بھی پیا اور حضرت ابوبکرؓ کو بھی پلایا اور حضرت عمر فاروقؓ کو بھی پلایا۔ مگر حضرت فاروق اعظمؓ کو زیادہ پلایا۔ حالانکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ درجہ میں زیادہ مقام رکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کا عرصہ مختصر صرف دو سال تھا اور حضرت فاروق اعظمؓ کا عرصہ دس سال تھا۔ تو سیدنا حضرت فاروق اعظمؓ نے علم کی خوب

خدمت کی۔

جب حضرت شاہ جی کشمیری رحمتہ اللہ کی میت کو نہلا کر کفنا کر رکھا گیا تو منہ سے دودھ نکلنے لگا ایک تر ہو گیا اسے بدلا گیا دوسرا بھی تر ہو گیا اس مرتبہ تو پیا بھی گیا ایسے معلوم ہوتا تھا کہ تازہ بھینس سے نکالا گیا ہے۔ تو ان کے سالے مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت آپکی تو کرامت ہو گئی مگر ہمارے لئے تو زحمت بن گئی۔ یہ کہنا تھا کہ دودھ نکلنا بند ہو گیا۔ تو دودھ علم کی علامت ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب رحمتہ اللہ علیہ، حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے استاد تھے۔ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ نے واقعہ لکھا ہے کہ جب کسی کو بیماری لگ جاتی تھی تو مزار سے مٹی لیکر استعمال کرنے پر شفاء ہو جاتی۔ اگر کسی کے کوئی زخم ہو جاتا تو مٹی لگانے سے شفاء ہو جاتی۔ مٹی اٹھانے سے کم ہو جاتی تو ان کے فرزند دوسری تازہ مٹی ڈالدیتے۔ ایک دن ان کے فرزند نے کہا کہ حضرت آپ کی تو کرامت ہو گئی مگر ہمارے لئے زحمت بن گئی۔ اس کے بعد پھر کسی کو شفاء نہ ہوئی۔

معجزہ و کرامت فعلِ خداوندی ہے نہ کہ ولی کا فعل ہے۔ مولوی عبدالخالق رحمتہ اللہ جو آپکے ہاں جامعہ عباسیہ میں بھی رہ گئے ہیں۔ ان کی فاتحہ خوانی کے سلسلہ میں بکیر والا گیا۔ ان کی رہائش کی کوٹھڑی دیکھی۔ ان کی وفات کے بارے دریافت کیا پتہ

چلا کہ آپ کا عام معمول تھا کہ تہجد پڑھتے۔ پھر قرآن شریف کی تلاوت کرتے، پھر مراقبہ کرتے اور جب نماز کا وقت قریب ہو جاتا تو مسجد میں تشریف لے آتے۔ اس دن نماز میں تشریف نہ لائے جا کر دیکھا تو مراقبہ کی صورت میں گردن جھکائے بیٹھے ہیں اور جان نکل چکی ہے۔ یہ ہے اللہ والوں کی موت۔

تو حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ فرماتے تھے کہ مرزا قادیانی نے جو پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے ہمیں اس پر افسوس نہیں ہمیں تو اس کے مریدوں پر افسوس ہے۔ مرزا نے یہ فیصلہ اس لئے کیا ہے کہ دین بیچ کر دنیا کماؤں۔ تو اس نے مریدوں سے کمائی۔ مگر مریدوں کو کیا ہوا کہ دنیا دیکر بھی دین بیچتے ہیں۔ آپ نے اپنے آخری وقت میں فرمایا کہ میری چارپائی مسجد لے چلو وہاں فرمایا کہ ابھی انکشاف ہوا ہے کہ جو شخص مرزائیوں سے بغض و عداوت رکھے گا اور ان کی تردید کرتا رہے گا اس پر جنت واجب ہے۔ گویا اس ایک فعل سے لاکھ عبادتیں کم درجہ رکھتی ہیں۔

منافقوں کی تین چیزیں ماحول، خوف اور رضاء عقل و شرع دونوں کے خلاف ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی رضاء کے مقابلہ مین مخلوق کی رضاء لینا اور خوف مخلوق کو خوفِ خدا پر ترجیح دینا۔ اسی طرح اتباعِ ماحول وغیرہ یہ عقل کے خلاف ہیں۔ مسلمان کی اولاد کو پہلے یہ پڑھایا جاتا تھا امنت باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ الخ خود حضور کریم

صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی ارشاد ہے کہ بیان کر دو کہ میں تو اپنے نفع و نقصان کا مالک نہیں۔ جب یہ معلوم ہے کہ سب کچھ اللہ تعالےٰ کے ہاتھ ہے۔ تو پھر مخلوق کو فائدہ کے خیال سے خوش کرنا یا ضرر کے خیال سے خوش کرنا کہ تکلیف نہ دے تو پھر تو یہ غلط ہوا۔ جب آدمی کی عقل کمزور ہوتی ہے تو وہ اسباب پر نظر رکھتا ہے اور جب عقیدہ پختہ اور حقیقت ہو تو پھر اللہ کی طرف نظر رکھتا ہے۔

مثلاً کسی قتل کے مقدمے میں جج صاحب آخری تاریخ کو سزاء موت لکھتا ہے۔ تو اس جملہ کی وجہ سے مجرم کو پھانسی دی گئی۔ تو لوگ سوچیں گے کہ پھانسی کا اصل سبب کیا ہے۔ تو یقینی بات ہے کہ وہ جرم ہے جس نے یہ قتل کیا تھا۔ اور اصلی فاعل و عامل کون ہے۔ تو پہلی نگاہ قلم پر پڑیگی کہ قلم نہ لکھتا تو پھانسی نہ ہوتی۔ تو وہ قلم کو مؤثر قرار دے گا۔ جو اس سے زیادہ سمجھدار وہ کہیگا کہ قلم کا کیا قصور انگلیاں اگر نہ لکھتی تو حکم نہ ہوتا۔ تیسرے درجہ کا شخص کہیگا کہ یہ کاروائی ہاتھ نے کی اور چوتھا شخص کہیگا کہ جان کا قصور ہے اگر جج کے اندر جان نہ ہوتی تو یہ حکم نہ ہوتا۔ پانچواں شخص اس سے ہوشیار ہو گا وہ کہیگا جان کیا جان تو پہلے سے ہے تو پھانسی آج سے پہلے کیوں نہ ہوئی سارا قصور جج کے ارادہ کا ہے۔ اگر وہ ارادہ نہ کرتا تو پھانسی نہ آتی۔ آخر ارادہ پر نظر جا پڑی جو جان سے بھی مخفی ہے۔ چھٹا اس سے بھی دانا ہو گا وہ کہے گا کہ

صفت ارادہ تو پہلے بھی موجود تھی۔ دوسرا شخص کہے گا قتل کا ثبوت ہو گیا تھا اس لئے پھانسی کی سزا دیگئی۔ تو وہ کہے گا کہ ایسے قاتل بھی موجود ہیں جنہیں سزا نہیں دیگئی۔ تو آخر میں کہیگا وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ۔ کہ ارادہ اللہ تعالیٰ بناتا ہے۔ جب تک اس کی طرف سے فیصلہ نہ ہو تو کوئی کام نہیں ہوتا

حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ساری کائنات جمع ہو جائے کہ ایک شخص کو نفع پہنچے اور میں نہ چاہوں تو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ اسی طرح نقصان۔

تو منافقوں کی یہ حالت ہے کہ مومنوں سے کوئی بات کرتا ہے اور شیطانوں سے اور بات کہتا ہے۔ یہ منافقت ہے۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اس مرض سے بچائے۔

حضرت امام غزالی احیاء العلوم کی جلد چہارم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ جب زور کی ہوا چلتی تھی تو حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک تبدیل ہو جاتا تھا۔ اور حجرہ سے اندر اور باہر آنا شروع کر دیتے (یعنی پریشانی ہوتی) اور فرماتے تھے ڈر ہے کہ قیامت نہ آجائے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ حضرت عمرؓ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ سورۃ اذا الشمس کورت میں جب یہ بیان

آیا کہ قیامت میں نامہ اعمال کھولے جائیں گے۔ تو بیہوش ہو کر گر پڑے اور چارپائی پر گھر لیگئے۔

سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک مرتبہ بھوسے کا تنکا اٹھا کر فرمایا۔ کاش میں اس بھوسے کے تنکے کی طرح ہوتا کہ قیامت میں حساب نہ لیا جاتا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے وقت روس جزیہ ادا کرتا تھا۔ پٹواری وغیرہ آذربائیجان کے علاقہ میں جذیہ وصول کرنے گئے ہوئے تھے ایک بوڑھا آگیا کہ کیا رات خلیفہ فوت ہو گئے ہیں؟ گھوڑوں پر سفر ہوتا تھا۔ انہوں نے کہا ہمیں تو وہاں سے آئے ہوئے تین ماہ گزر گئے ہیں۔ بوڑھا کہنے لگا کہ میں کہتا ہوں کہ وہ آج رات فوت ہو گئے ہیں۔ کیونکہ پہلے بھیڑیا میرے بکریوں کے ریوڑ کی خفاظت کرتا تھا مگر آج رات اس نے حملہ کر کے ایک بکری اٹھالی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عادل بادشاہ فوت ہو گیا ہے۔ کارندوں نے تاریخ نوٹ کرلی۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ واقعی آپ اسی دن فوت ہوئے تھے۔

انہی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ کو ایک بڑھیا نے خواب سنایا۔ دیکھتی ہوں کہ پل صراط بجھ گیا ہے۔ ولید اور سلیمان بن ملک پل صراط سے گذرتے ہوئے گر گئے ہیں۔ بس یہ سننا تھا کہ آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ بڑھیا پریشان ہوئی

کہ سارا خواب تو سنا نہیں اب کیا کروں۔ تو آخر کار اس نے کان میں زور سے کہا کہ حضرت آگے تو سنو فنجوتَ، فنجوتَ، فنجوتَ کہ آپ پل صراط پر سے بجلی کی طرح گذر گئے۔ جب سنا تو ہوش میں آئے۔

درس نمبر ۲۴
9 دسمبر 1966ء

اِستہزاءِ الٰہی

اس سے پہلے درس میں ترجمہ گزرا ہے کہ منافق جب ایمانداروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں اور جب اپنے شریروں کے ساتھ ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ان سے (مسلمانوں) ہنسی کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اللہ بھی ان سے ہنسی کرے گا۔ وہ پریشان ہونگے۔ ان لوگوں کی تجارت نقصان مند ہوگی نہ کہ نفع مند۔ اور ان کو تجارت کا ڈھنگ بھی نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہم بھی ٹھٹھہ کریں گے۔ یہ بھی قرآن کی خاص اصطلاح ہے۔ اس سے گویا قرآن کی بہت سے مشکل چیزیں حل ہو جاتی ہیں۔ ہر برائی جس کے مقابلہ میں جوابی کارروائی کی جائے تو اس کا نام لیا جاتا ہے۔ قرآن۔ فمن اعتدیٰ علیکم۔ جو تم پر زیادتی کرے۔ فاعتدوا علیہ بمثل علیکم۔ تم بھی اس پر اسی طرح کی زیادتی کرو۔ اس نے بھی زیادتی کی اور تم نے بھی کی۔ تو قرآن نے دونوں کو ایک نام سے ذکر کیا ہے۔ کیونکہ فعل تو ایک ہے۔ البتہ جس

نے پہل کی اس کو گناہ ہوا۔ فراسیئۃ سیئۃ بمثلھا۔ یعنی آپ سے
جیسی کوئی برائی کرے ویسی آپ بھی اس سے کریں۔ اسے صنعت
مشاکلہ۔ یعنی برے کام کے مقابلہ میں بدلہ اسی شکل میں لینا چاہیے۔
تو منافقوں کا یہ مذاق تھا کہ دل میں ایمان نہیں تھا مگر مومنوں کے
سامنے ایمان کا اظہار کرتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں جوابی کاروائی
یہ ہے۔ 1۔ بظاہر ایمان کا دعوٰی کیا۔ 2۔ روزہ وغیرہ بھی ان میں
تھا یہ بھی نیکی وغیرہ تھی۔ تو ہم بھی یہ مذاق کریں گے کہ دنیا میں جو
مسلمان کے حقوق ہیں وہ تمہارے بھی ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ
انہوں نے ظاہری ایمان سے دنیا میں نفع تو اٹھایا لیکن آنکھ بند
ہوتے ہی قبر میں معاملہ پلٹ جائے گا۔ ان المنافقین فی الدرک
الاسفل من النار۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ تم نے دہری کاروائی
کی تھی۔ کہ دل میں کفر اور زبان پر ایمان تھا۔ اسی طرح اللہ نے بھی
مذاق و ٹھٹھہ کیا کہ دنیا میں تو فائدہ دیا مگر اب جہنم میں سب سے کم
درجہ کی نچلے درجہ میں تمہیں رکھا۔ دیکھو انگریزی ماحول والے بھی
بیوقوف ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو خدا مان بیٹھے ہیں۔ میرا
خیال ہے کہ دو ٹانگوں والے کو تو بیل بھی خدا نہ مانیں گے۔ تو جو
اللہ سے ٹھٹھہ کرے گا اللہ بھی ان سے ٹھٹھہ کرے گا۔ کہ جس طرح
ان کے دل میں کچھ اور زبان پر کچھ اور تھا۔ اسی طرح اللہ نے بھی دنیا
میں ان سے اور معاملہ کیا اور آخرت میں اور۔ تو آخرت میں دردناک

عذاب ہو گا۔

منافقوں کی پہلی سزا تو استہزاء الٰہی ہے بتحفظ قانون فی الدنیا۔ ویمدھم فی طغیانہم یعمھون۔ اور ان کو مہلت دیں گے کہ وہ اپنی سرکشی میں دل کے اندھے ہو کر چلیں گے۔اس سے یہ مسئلہ حل ہوا کہ اللہ کے نزدیک منافقوں کے لئے سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ (منافقوں کی عمر دراز ہو اور عمل خراب ہو) تو نفسِ عمر لمبا ہونا بذات خود تو مضر نہیں۔ مگر جب تک اس کے ساتھ دوسرا حصہ عمل خراب کا نہ مل جائے۔ آج جبکہ لوگ آخرت سے غافل ہیں۔ حضرت عطا اللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں نے ابو الکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ اللہ آپ کی عمر لمبی کرے۔ جواب دیا کہ نہ تھوڑی ہو سلیقے کی ہو۔ تو عمر لمبی ہو اور گمراہی میں خرچ ہو تو یہ بڑا عذاب ہے۔

حدیث :۔ جمع الفوائد۔ خیر کم من طال عمرہ وحسن عملہ۔ تم میں بہتر وہ شخص ہے جسکی عمر لمبی ہو اور عمل نیک ہو۔ اشر کم من طال عمرہ وساء عملہ۔ اور تم میں بدتر وہ ہے جسکی عمر لمبی ہو اور عمل برا ہو۔ آج مرزائی وغیرہ امریکہ وغیرہ میں جو تبلیغ کرتے ہیں سوال یہ ہے کہ وہ تبلیغ ایمان کی ہے یا کفر کی اگر کفر کی تو پھر تبلیغ کا کیا فائدہ۔ عیسائی تو ان سے بھی زیادہ تبلیغ کرتے ہیں۔ تو ایک حق کی تبلیغ ہے اور ایک باطل کی۔

تو اس آیت سے منافقوں کے لیے دو سزائیں ثابت ہوئیں ۔1۔ تبدل قانون ۔2۔ مہلت دینا۔ اور بات یہ ظاہر ہوئی کہ عمر لمبی ہو اور عذاب زیادہ ہو۔ یہ کیوں۔ دیکھو دنیا میں ایک نیکی اور ایک بدی ہے۔ اور آگے ان کے مرکز ہیں۔ ایک جنت اور ایک جہنم۔ اب لوگ دو قسم کے ہیں۔ ایک مومن گناہگار اور ایک کافر۔ کافر کفر کی وجہ سے ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ مگر کافر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ضرر ناک کافر دوسرا غیر ضرر ناک۔ تو نفس جرم کی وجہ سے تو جہنم میں رہے گا۔ اور جس طرح کا عمل کرے گا اسی طرح کی سزا مقرر ہو گی۔ دیکھو جیل خانہ کو جہنم تصور کر لو اگر دو قیدی عمر بھر کے لئے جیل چلیں جائیں۔ ایک کو روزانہ دس سیر گندم پیسنا پڑے اور دوسرے کو چالیس سیر۔ تو مطلب یہ ہے کہ سزا کی میعاد تو ایک ہے مگر سزا کم و بیش ہے۔ اسی طرح کافر بھی جہنم میں ایسے ہی ہو گا۔ یہ تو کافر کیلئے ہوا۔ اب رہا مومن۔ تو مومن کیلئے یہ ہے کہ دین کے سارے عقائد پختہ ہوں اور صرف عملی کوتاہی ہو گئی ہو تو جرائم کی مقدار پر سزا ہو گی۔ تو جس کی عمر لمبی ہو گی تو اس وجہ سے اس کے گناہ بڑھ جائیں گے تو آخرت کی تکلیف بڑھ جائے گی۔ تو حقیقت میں لمبی عمر گناہگاری میں آخرت کی تکلیفات خریدنا ہے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا۔ فی طغیانہم یعمہون ۔ کہ ان کو اللہ مہلت دے گا تو وہ سرکشی میں پھریں گے۔ قرآن

کہتا ہے کہ منافقوں نے ہدایت دیکر گمراہی لی ان کی تجارت نفع مند نہ ہوئی۔ منافقوں نے دینی تجارت میں نقصان اٹھایا حقیقت میں انہیں تجارت کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔ دین کی تجارت ایسی ہے اگر غفلت ہو گئی تو پھر بربادی ہے۔ اور اگر تجارت کی گئی تو پھر بادشاہی ہے یہ مسئلہ قرآن کی متعدد آیات میں بیان ہوا ہے۔

تجارت کا مسئلہ یوں سمجھو کہ ہر تجارت کے لئے ایک پونجی چاہیے۔ مثلاً آپ تجارت کی غرض سے کراچی جائیں تو کچھ نہ کچھ لے جائیں گے۔ مثلاً راس المال نقدی وغیرہ۔ اور جو خریدیں گے اسے مال تجارت کہتے ہیں۔ اللہ نے انسان کو دنیا میں بھیجا اور مال تجارت خریدنے کیلئے پیسہ بھی اسے خود دیا۔ دنیا کی تجارت میں تو سرمایہ انسان کا خود اپنا ہے۔ مگر دین کی تجارت میں سرمایہ اللہ کی چیز ہے۔ وہ کیا ہیں؟ علماء نے تین چیزیں بیان فرمائی ہیں۔ 1۔ عمر۔ 2۔ عقل۔ 3۔ عمل۔

اللہ نے عمر بھی بخشی اور عقل بھی عطا کی ہے اور عمل کرنے کی قوت بھی بخشی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان تین چیزوں میں ایک چیز کم ہو تو آخرت کی تجارت صحیح طریقہ سے نہیں ہوتی۔ اگر عمر ختم ہو جائے تو پھر کیا کرے گا۔ اسی طرح عقل نہو تو کیا کرے گا۔ اور اگر عمل کی قوت نہو تو کیا کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نابالغ بچہ احکام کا مکلف نہیں کیونکہ وہ عمل نہیں کر سکتا

تو اس آیت سے منافقوں کے لیے دو سزائیں ثابت ہوئیں ۔1۔ تبدل قانون ۔2۔ مہلت دینا۔ اور بات یہ ظاہر ہوئی کہ عمر لمبی ہو اور عذاب زیادہ ہو۔ یہ کیوں۔ دیکھو دنیا میں ایک نیکی اور ایک بدی ہے۔ اور آگے ان کے مرکز ہیں۔ ایک جنت اور ایک جہنم۔ اب لوگ دو قسم کے ہیں۔ ایک مومن گناہگار اور ایک کافر۔ کافر کفر کی وجہ سے ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ مگر کافر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ضرر ناک کافر دوسرا غیر ضرر ناک۔ تو نفس جرم کی وجہ سے تو جہنم میں رہے گا۔ اور جس طرح کا عمل کرے گا اسی طرح کی سزا مقرر ہو گی۔ دیکھو جیل خانہ کو جہنم تصور کر لو اگر دو قیدی عمر بھر کے لئے جیل چلیں جائیں۔ ایک کو روزانہ دس سیر گندم پیسنا پڑے اور دوسرے کو چالیس سیر۔ تو مطلب یہ ہے کہ سزا کی میعاد تو ایک ہے مگر سزا کم و بیش ہے۔ اسی طرح کافر بھی جہنم میں ایسے ہی ہو گا۔ یہ تو کافر کیلئے ہوا۔ اب رہا مومن۔ تو مومن کیلئے یہ ہے کہ دین کے سارے عقائد پختہ ہوں اور صرف عملی کوتاہی ہو گئی ہو تو جرائم کی مقدار پر سزا ہو گی۔ تو جس کی عمر لمبی ہو گی تو اس وجہ سے اس کے گناہ بڑھ جائیں گے تو آخرت کی تکلیف بڑھ جائے گی۔ تو حقیقت میں لمبی عمر گناہگاری میں آخرت کی تکلیفات خریدنا ہے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا۔ فی طغیانہم یعمہون ۔ کہ ان کو اللہ مہلت دے گا تو وہ سرکشی میں پھریں گے۔ قرآن

کہتا ہے کہ منافقوں نے ہدایت دیکر گمراہی لی ان کی تجارت نفع مند نہ ہوئی۔ منافقوں نے دینی تجارت میں نقصان اٹھایا حقیقت میں انہیں تجارت کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔ دین کی تجارت ایسی ہے اگر غفلت ہو گئی تو پھر بربادی ہے۔ اور اگر تجارت کی گئی تو پھر بادشاہی ہے یہ مسئلہ قرآن کی متعدد آیات میں بیان ہوا ہے۔

تجارت کا مسئلہ یوں سمجھو کہ ہر تجارت کے لئے ایک پونجی چاہیے۔ مثلاً آپ تجارت کی غرض سے کراچی جائیں تو کچھ نہ کچھ لے جائیں گے۔ مثلاً راس المال نقدی وغیرہ۔ اور جو خریدیں گے اسے مال تجارت کہتے ہیں۔ اللہ نے انسان کو دنیا میں بھیجا اور مال تجارت خریدنے کیلئے پیسہ بھی اسے خود دیا۔ دنیا کی تجارت میں تو سرمایہ انسان کا خود اپنا ہے۔ مگر دین کی تجارت میں سرمایہ اللہ کی چیز ہے۔ وہ کیا ہیں؟ علماء نے تین چیزیں بیان فرمائی ہیں۔ 1۔ عمر۔ 2۔ عقل۔ 3۔ عمل۔

اللہ نے عمر بھی بخشی اور عقل بھی عطا کی ہے اور عمل کرنے کی قوت بھی بخشی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان تین چیزوں میں ایک چیز کم ہو تو آخرت کی تجارت صحیح طریقہ سے نہیں ہوتی۔ اگر عمر ختم ہو جائے تو پھر کیا کرے گا۔ اسی طرح عقل نہ ہو تو کیا کرے گا۔ اور اگر عمل کی قوت نہ ہو تو کیا کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نابالغ بچہ احکام کا مکلف نہیں کیونکہ وہ عمل نہیں کر سکتا

وغیرہ۔ آخرت کی تجارت کے لیے اتنا ضروری ہے کہ ہمیں اتنی عمر مل جائے کہ ہم دین کی خدمت کرسکیں۔ اولم نعمر کم ما یتذکر فیہ من تذکر وجائکم النذیر عمر ایک ایسی چیز ہے کہ اس وقت غفلت کی وجہ سے ہمارے پاس کوئی قیمت نہیں۔ مگر جب میدان قیامت میں قدم رکھیں گے تو معلوم ہو گا۔ جب کفار دیکھیں گے کہ ایمان والوں کو ایک ایک نیکی پر کیا اجر مل رہا ہے۔ تو وہ کہیں گے۔ ربنا ما کنا مشرکین۔ کہ یا اللہ ہم نے تو آپ سے کبھی شرک و کفر نہیں کیا۔ مگر وہاں جھوٹ تو چل نہیں سکے گا۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نامہ اعمال دکھائیں گے۔ پھر فرشتے گواہی دیں گے۔ اگر کفار یہ بھی نہ مانیں گے تو پھر ہر عضو بول اٹھے گا کہ ہم نے گناہ کیا ہے اور زمین کے جس ٹکڑے پر گناہ کیا ہوگا وہ بھی حالات سے آگاہ کریں گے یہ چیزیں قرآن میں مختلف جگہوں پر ذکر ہیں۔ الیوم نختم علی افواھم وتکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم۔ کہ ان کے ہاتھ پاؤں بول اٹھیں گے۔ جب کافر دیکھیں گے کہ اب کچھ نہیں بن سکتا۔ تو پھر کہیں گے کہ یا اللہ ایک سیکنڈ کی دنیاوی زندگی بخش دو۔ رب ارجعونی لعلی اعمل صالحا فیما ترکت کلا۔ آج تو عمر نہیں مل سکتی۔ تم کو تو عمر دراز دی تھی وہ تو خبیث انگریز کی محفل میں گزار دی اب کیا۔ رات تہجد کے وقت جمع الفوائد کی حدیث نظر سے گزری۔ حیران ہوا کہ اللہ نے آپ کو آئندہ زمانہ کا کس قدر علم دیا تھا۔ صنفان امتی۔ میری امت

کے دو قسم کے لوگ فی النار لم ارھما آگ میں ہونگے میں نے اب تک ان کو نہیں دیکھا۔ قوم بایدیھم سوط واحد۔ ایک قوم ہے کہ ان کے ہاتھ میں چابک ہوگا۔ کاذناب البقر گائے کی دم کی طرح۔ یضربون الناس۔ کہ وہ اس سے لوگوں کو مارتے ہونگے۔ تو اس سے معلوم ہوا یہ پولیس والے ہیں جو ظالم ہیں۔ ہم نے انگریز کی پولیس کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں چابک ہوتے تھے۔ پھر معلوم ہوا کہ بنی عباس کے وقت جو پولیس بنی تھی ان کی بعینہٖ شکل اسی طرح تھی۔ ونساء۔ اور دوم وہ عورتیں ہیں جو کاسیات عاریات۔ کپڑے پہنے ہوں گی اور ننگی ہوں گی۔ میں حیران تھا کہ کپڑوں کے باوجود ننگی ہوں گی یہ کیا؟ تو آج کل دیکھو کہ لباس ہی ایسا ہے کہ ننگی نظر آتی ہیں۔

اس سے حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اور کیا دلیل ہو گی کہ جو کام چودہ سو سال بعد ہونے والا ہے وہ پہلے فرمایا جا رہا ہے۔ آگے ہے مائلات۔ کہ مردوں کی طرف مائل ہوں گی۔ ممیلات۔ اور مردوں کو اپنی طرف مائل کرنے والی ہونگی۔ بن ٹھن کر نکلیں گی کہ اس سے کسی نوجوان کا دل ہماری طرف کھنچ جائے۔ آج کے اپوا وغیرہ اسی ضمن میں آتے ہیں۔ اور مرد و زن کو ایک جگہ اکٹھی تعلیم دی جا رہی ہے۔ یہ تو آگ اور پانی کو اکٹھا کیا۔ اے خدائے آسمان تو ان کو ہدایت دے۔

عشق گناہ اور عشق زنا کرتا ہے۔ مائلات ومؤلات۔ مردوں کی طرف جھکنے والی اور مردوں کو اپنی طرف جھکانے والی ہونگی۔ رؤسھن کاسنام البخت۔ ان کے سر کے بال اونٹ کی کوہان کی مانند ہوں گے۔ یعنی بال کتروائیں گی۔ قربان جاؤں اس پیغمبر پر جس کے سینہ میں اللہ نے چودہ سو سال پہلے یہ بات رکھی۔

تو عورتوں کے حسب ذیل اعمال جہنمیہ ہیں۔

(1) غیر شرعی لباس، یعنی لباس کے باوجود ننگا پن۔ (2) مرد و زن کا ناجائز اختلاط۔ (3) بالوں میں خلاف شرع تصرف۔ یہ بال اور سارا وجود اللہ کی امانت ہے۔ تو ان میں تصرف مالک کے حکم کے مطابق ہوگا۔ ہاں حج کا احرام باندھے تو تھوڑے سے بال کٹوالے۔ تو عجیب بات ہے کہ مرد کیلئے سر منڈوانا ہے مگر عورت کیلئے تھوڑے سے بال کتروانا ہے۔ تاکہ محرم اور غیر محرم کا پتہ چل جائے۔ تو سر منڈوانا یا بال کتروانا تو عورت کو حج میں بھی اجازت نہیں۔ اور حج جیسی عبادت میں بھی حکم ہے کہ محرم کے بغیر نہیں جاسکتی۔ اس سے آپ اللہ کی ذات اور ان کے انداز کو تو معلوم کرسکتے ہیں۔

دیکھو حج کا سفر بذات خود ایک پاک سفر ہے اور جانے والے بھی نیک ہوتے ہیں۔ پھر بھی اللہ کا حکم ہے کہ جب تک محرم نہو نہ جاؤ۔ اور جب کہ یہ بدمعاش لوگوں کے ساتھ کلب

میں ناچ کرے تو اس کو شریعت برداشت کرے گی؟

تو اللہ تعالیٰ کا عجیب قانون ہے کہ پھر محشر کے بعد زندگی نصیب نہ کرے گا۔ ہر کام ٹھکانے پر ہوتا ہے۔ ومن ورائہم برزخ۔ کہ ہر کام کی آڑ بنا دی ہے۔ اِدھر ہے اُدھر نہیں۔ عمل دنیا میں ہے آخرت میں نہیں۔ اب تو رمضان المبارک بھی آرہا ہے۔ اس تجارت کے لیے رمضان شریف سے بڑھ کر اور کوئی دن نہیں۔ علماء کا قول ہے کہ پندرہ شعبان کی شب سے اللہ تعالیٰ اپنے ایک سال کا پروگرام فرشتوں کو بتلاتا ہے۔ کہ فلاں فلاں مریں گے وغیرہ وغیرہ۔ اور علماء کا قول ہے کہ پندرہ شب شعبان سے شروع ہوتا ہے۔ اور لیلۃ القدر کی شب تک ہوتا رہے گا۔ دیکھو جس طرح حکومت کے بعض کام جنوری میں شروع ہوتے ہیں اور مارچ اپریل میں پورے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی اسی طرح ہے۔

روح المعانی میں انا انزلناہ فی لیلۃ القدر۔ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ شب برات کو جو دفتر لکھا جاتا ہے وہ یوں ہے کہ بارہ ماہ کی زندگی و موت کے پورے نظام کا رجسٹر ملک الموت کے حوالے ہوجاتا ہے۔ اور نفع و نقصان کا رجسٹر جبرائیل علیہ السلام کے حوالے ہو جاتا ہے اور روزی وغیرہ کا رجسٹر میکائیل علیہ السلام کے حوالے ہو جاتا ہے۔ اور پھر آسمان میں اعلان ہوتا ہے کہ پورا سال

ان کے تحت کام ہوگا۔ پندرہ شعبان سے ستائیس رمضان تک بیالیس دن ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان بیالیس دنوں میں عالم بالامیں انسان کی کارروائی مکمل ہوجاتی ہے۔

صحیح حدیث کے مطابق ہر عمل کا ثواب رمضان شریف میں ستر (70) گنا بڑھ جاتا ہے۔ تلاوتِ قرآن، نوافل، خیرات وغیرہ جو کچھ نیکی کریں گے ستر گنا اضافہ ہوگا۔ پھر جسطرح دنیاوی بادشاہ ایک دن بخشش عام کرتے ہیں بعینہ شہنشاہ حقیقی اللہ تعالےٰ کے ہاں بھی نعمت تقسیم ہوتی ہے۔ تو وہ بدبخت ہوگا جو رمضان میں نیکی نہ کرے گا۔ علماء کا قول ہے کہ رمضان شریف کی نیکی سے قلب میں جو نور پیدا ہوتا ہے اس کا اثر آئندہ رمضان تک رہتا ہے۔ تو سب سے بڑی نعمت یہ کہ اللہ کو ہم سے محبت اور ہم کو اللہ سے محبت ہو۔ تو انسان کی کل محبوبات چار ہیں۔ (1) بیوی سے محبت (2) کھانے سے محبت (3) پینے سے محبت (4) نیند سے محبت۔

تو رمضان میں یہ چاروں محبتیں اللہ تعالےٰ پر قربان ہیں۔ کہ بیوی سے پرہیز، کھانے سے پرہیز، اور نیند کی بھی قربانی ہوتی ہے۔ کہ رات کا حصہ کچھ تراویح میں خرچ اور کچھ سحری میں خرچ۔ اور کچھ شب کی نیکی میں خرچ۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ رمضان شریف میں اکاسٹھ (61) ختم قرآن کرتے تھے۔ اور امام

بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے بھی ساٹھ (60) ختم قرآن ہوتے تھے۔ تو کہتے ہیں کہ جب رمضان شریف کا مہینہ گزرتا تو یہ حضرات بہت خوش ہوتے تھے۔ خوشی اس بات کی کہ اس بابرکت مہینہ میں اللہ تعالے نے عبادت کی توفیق عطا فرمائی۔

ان کے تحت کام ہوگا۔ پندرہ شعبان سے ستائیس رمضان تک بیالیس دن ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان بیالیس دنوں میں عالم بالامیں انسان کی کارروائی مکمل ہوجاتی ہے۔

صحیح حدیث کے مطابق ہر عمل کا ثواب رمضان شریف میں ستر (70) گنا بڑھ جاتا ہے۔ تلاوتِ قرآن، نوافل، خیرات وغیرہ جو کچھ نیکی کریں گے ستر گنا اضافہ ہوگا۔ پھر جسطرح دنیاوی بادشاہ ایک دن بخشش عام کرتے ہیں بعینہ شہنشاہ حقیقی اللہ تعالے کے ہاں بھی نعمت تقسیم ہوتی ہے۔ تو وہ بدبخت ہوگا جو رمضان میں نیکی نہ کرے گا۔ علماء کا قول ہے کہ رمضان شریف کی نیکی سے قلب میں جو نور پیدا ہوتا ہے اس کا اثر آئندہ رمضان تک رہتا ہے۔ تو سب سے بڑی نعمت یہ کہ اللہ کو ہم سے محبت اور ہم کو اللہ سے محبت ہو۔ تو انسان کی کل محبوبات چار ہیں۔ (1) بیوی سے محبت (2) کھانے سے محبت (3) پینے سے محبت (4) نیند سے محبت۔

تو رمضان میں یہ چاروں محبتیں اللہ تعالے پر قربان ہیں۔ کہ بیوی سے پرہیز، کھانے سے پرہیز، اور نیند کی بھی قربانی ہوتی ہے۔ کہ رات کا حصہ کچھ تراویح میں خرچ اور کچھ سحری میں خرچ۔ اور کچھ شب کی نیکی میں خرچ۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ رمضان شریف میں اکاسٹھ (61) ختم قرآن کرتے تھے۔ اور امام

بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بھی ساٹھ (60) ختم قرآن ہوتے تھے۔ تو کہتے ہیں کہ جب رمضان شریف کا مہینہ گزرتا تو یہ حضرات بہت خوش ہوتے تھے۔ خوشی اس بات کی کہ اس بابرکت مہینہ میں اللہ تعالے نے عبادت کی توفیق عطا فرمائی۔

درس نمبر ۲۵
11، دسمبر 1966ء

مُنافق کی تجارَت نفع مَند نہیں

اس سے پہلے درس میں منافقوں کی اس حالت کے سلسلے میں کہ ان کی تجارت برباد ہو گئی۔ یہ بیان کیا تھا کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو آخرت کی تجارت کے لئے تین سامان دئے۔ 1۔ عمر -2۔ عقل۔ 3۔ عمل۔ اور ان تین کے متعلق قرآن کے اشارات ہیں۔ اولم نعمرکم۔ اللہ تعالےٰ قیامت میں فرمائے گا کہ میں نے تمہیں اتنی عمر دی تھی اگر تم نصیحت پر چلتے تو چل سکتے تھے۔ خلق الموت والحیوٰۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً۔ قرآن کا یہ اشارہ عمل کے متعلق ہے۔ عقل بھی اخروی تجارت کا سامان ہے لوکنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحٰب السعیر۔ جب کفار دوزخ میں ڈالیں جائیں گے تو کہیں گے کہ اگر ہمیں تھوڑی بھی عقل ہوتی تو ہم برے ٹھکانے میں نہ آتے۔ تجارت کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو چیز جس مقصد کیلئے ہو اس کو ٹھیک اپنی جگہ صرف کیا جائے۔ مثلاً عمر۔ اور عمر ایک ایسی چیز ہے کہ اس سے آدمی جنت و جہنم، نیکی

و بدی وغیرہ سب کچھ کما سکتا ہے۔ تو عمر حقیقت میں کمائی کا زمانہ ہے۔ دنیاوی زندگی میں اگر جنت کمانا چاہیں تو کما سکتے ہیں اور اگر جہنم کمانا چاہیں تو کما سکتے ہیں۔ اور عمر ایک ایسا وقت ہے کہ اربوں روپے کے بدلے ایک سیکنڈ بھی نہ ملے گی۔ عقل کے ذریعے حق و باطل کی شناس کرنی چاہیئے۔ نیکی و بدی کمانا وغیرہ یہ عمر کا مقصد ہے۔ اور عقل کا مقصد حق شناسی ہے۔ مثلاً منہ ذائقہ معلوم کرتا ہے اور ناک خوشبو وغیرہ کیلئے ہے۔ اور عقل محض حق و باطل کے امتیاز کیلئے ہے۔ تو جس نے عقل سے اس کا مقصد نہ لیا بلکہ باطل کو حق اور حق کو باطل جانا تو یہ اسکی درحقیقت بے عقلی ہے۔ عقل نہیں۔ اس لئے تو کافر کہیں گے، نسمع او نعقل ما کنا فی اصحٰب السعیر۔ اس کے بعد عمل ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہمارے اندر عمل کی جو طاقت رکھی ہے۔ یہ محض اس لیے ہے کہ اس سے جنت کمائیں۔ قاعدہ کی بات ہے کہ اگر آدمی ان تین چیزوں کو غلط راستے پر لگائے تو یہ خدا داد سرمایا بھی برباد ہو گیا۔ ان برائیوں کی وجہ سے اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی کے دس بچے ہوں اور ذریعہ معاش صرف بھینسوں کا دودھ بیچنا ہو۔ اب یقینی بات ہے کہ اگر اس کے دودھ میں روزانہ چند پیشاب کے قطرے گر جائیں تو ناپاک دودھ کو تو کوئی نہیں خریدے گا۔ اسی طرح عمر، عقل، اور عمل ہمارے دودھ ہیں۔ اگر انہیں برائی میں صرف

کریں تو یہ ناپاک ہو گئے تو اصل چیز بھی ہاتھ سے گئی۔ یہ منافقوں والا معاملہ ہوا۔ اولٰئک الذین اشترو الضلالۃ بالھدیٰ فما ربحت تجارتہم۔ کہ منافقوں نے حق کے عوض گمراہی خریدی ۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ان کی تجارت نفع مند نہوئی اور نہ وہ ہدائیت پائیں گے۔

(اعتراض) کہ منافقوں کے پاس ہدائیت تو تھی نہیں تو اللہ تعالےٰ نے یہ کیوں فرمایا کہ ہدائیت دے کر گمراہی خریدی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہدائیت تو نہ تھی مگر عمر و عقل کا سرمایا تو موجود تھا۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کے اندر ایک فطری روشنی اور نور رکھا ہے۔ جس سے ایمان حاصل کیا جاتا ہے۔ اور منافقوں کے وقت تو خود حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرامؓ موجود تھے ۔ ان سے ہدائیت حاصل کر سکتے تھے ۔ مگر انہوں نے اسے کھو دیا۔ اس سے یوں جانو کہ ایک آدمی کے پاس، بیلوں کا جوڑا، زمین و تخم موجود ہے۔ کھیتی کا سارا سامان موجود ہے مگر اس نے تخم کو دریا میں ڈال دیا۔ تو بتاؤ کہ حضرت نبی کریم صلےٰ علیہ وسلم کی موجودگی اور وحی کا نزول پھر بھی ان بدبختوں نے اس موقع کو ضائع کیا اور تجارت سے نقصان اٹھایا۔

بزرگان فرماتے ہیں کہ دنیا آخرت کی تجارت کی

منڈی ہے۔ اس میں کہیں اسلام ہے۔ کہیں قادیانیت ہے۔ کہیں پرویزیت وغیرہ ہے۔ بہت سا سامان رکھ دیا گیا ہے۔ جس طرح منڈی میں بکری، گائے وغیرہ کی خریداری کیلئے دلال ہوتے ہیں۔ جو خریدار اور فروخت کرنے والے کو مائل کرتے ہیں۔ اور اس مائلیت میں بسا اوقات دھوکہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالے کو یہ معلوم تھا کہ دنیا کی منڈی میں حق کی جگہ لوگ باطل کا سامان رکھیں گے۔ اور بڑے بڑے دلال ہونگے تاکہ لوگوں کو دھوکہ دیں۔ تو ان دلالوں کو مٹانے اور ان کے دھوکہ کو ظاہر کرنے کیلئے حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کو عطا فرمایا۔ قرآن و حدیث میں ہے کہ ہر دور میں قیامت تک ایک گروہ ایسا ہوگا جو حق پھیلائے گا اور غالب رہے گا۔ حتی یأتی اللہ بامرہ۔ یعنی قیامت تک۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون۔ کہ قرآن و حدیث حق ہیں۔ اور میں ان کی حفاظت کروں گا۔ اس کے ضمنی معنی یہ کہ حق کی حفاظت حق والے کرتے ہیں۔ اور میں ان کی حفاظت کروں گا۔ تو معلوم ہوگیا کہ اہل حق ہمیشہ موجود رہیں گے۔ یہ تو خود قرآن فرما رہا ہے۔

آج یہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جب علماء ربانی ختم ہو جائیں گے تو پھر ہم ان لوگوں کو اچھی طرح گمراہ کر سکیں گے۔ مگر یہ بات تو خدا تعالےٰ کے خلاف ہے۔ کیونکہ خدا تعالےٰ فرما رہا ہے کہ حق والے ہمیشہ رہیں گے اور میں ان کی حفاظت کرتا رہوں گا۔ تو

اللہ تعالےٰ نے قرآن اور حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھیجا تاکہ جھوٹے دلالوں کا پتہ چل جائے۔

تو علماء ربانیین ملحدین کے مقابلہ میں ہمیشہ رہیں گے۔ وکذالک جعلنا لکل نبی عدواً۔ ہم نے ہر نبی کے لئے مخالف بنا رکھے ہیں۔ جس طرح حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت بھی مخالف تھے۔ تو علماء ربانیین کے بھی مخالف ہونگے۔ حق کی آواز کے مقابلے میں باطل کی آواز بھی موجود ہو گی۔

اس واقعے کو بزرگان نے ایک مثال کے ذریعے حل کیا ہے۔ کہ دین کی تجارت میں کیا کیا حالتیں پیش آتی ہیں۔ یقینی بات ہے کہ عمر، عقل اور عمل یہ سرمایہ ہیں انہیں جس کام میں لگائیں پھر یہ دوسرے کام میں نہیں لگ سکتیں۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ انہیں کہاں خرچ کرنا ہے۔ منافقوں نے انہیں گمراہی میں خرچ کیا۔ اور ہر ضلالتہ یعنی گمراہی ہلاکت کی طرف لیجاتی ہے۔ فرض کرلو کہ ایک کے پاس ایک سو روپیہ ہے۔ منڈی میں بچوں کی ضروریات زندگی کا سامان خریدنے گیا۔ غلہ اور گھی وغیرہ خریدنا تھا ایک دلال مل گیا کہنے لگا تجھے ایک بہتر چیز بتاؤں وہ لیلو اس سے تمہیں لاکھوں روپے آمدنی ہو گی۔ ایسی میٹھی تقریر کی کہ وہ دھوکہ میں آگیا۔ تو اپنی ضروریات کی چیز نہ خریدی اور نہ خریدنے والی خریدلی۔ وہ تھا "سم الفار"۔ تو دکاندار سے سو روپے کا سم الفار خرید

لیا۔ گھر جا کر شیشی میں بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ بیوی نے کہا کہ خالی ہاتھ آئے ہو۔ کہا کہ تم تو بیوقوف ہو یہ تو لاکھوں روپے کی چیز ہے۔ بیوی دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ سوچنے لگی کہ یہ قیمتی چیز ہے ممکن ہے کہ اسے شوہر بیچ ڈالے کچھ تو کھا لوں۔ خود بھی کھایا اور بچوں کو بھی کھلایا۔ 3 لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ وہ آدمی تو سویا پڑا تھا۔ بس وہ سب کے سب مر گئے۔ جب آنکھ کھلی تو انہیں مردہ پایا حیران ہوا شیشی کی طرف دیکھا کہ اس سے چیز استعمال کی گئی ہے۔ پھر کہنے لگا اُف یہ تو دھوکہ ہو گیا کہ مضر چیز کو فائدہ مند بتلا کر دیا گیا ہے۔ آج قادیانیت کو اسلام بنا کر بیچا جا رہا ہے۔ قادیانیت مذہب نہیں بلکہ کمپنی ہے خوب کمائی ہو رہی ہے۔ دنیا میں بہت سی چیزیں مذہب کے طور پر رکھی گئی ہیں تو لوگ دھوکہ میں آکر خریدیں گے۔ مرنا تو بہرحال ہے لیکن آخرت کی زندگی برباد ہو گئی تو پھر تو کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو فرمایا کہ منافقوں کو ان کی تجارت نے نفع نہ دیا۔ عجیب بدبخت ہیں کہ اتنی بڑی نعمت حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس گرامی ملی مگر نفع حاصل نہ کیا۔ آج بہت آنکھیں ترس رہی ہیں کہ روضہ اطہر دیکھیں۔ مگر انہیں تو مدینہ میں زندگی ملی اور سب برگزیدہ صحابیؓ بھی موجود تھے مگر ان بدبختوں کو کس دلال نے دھوکہ دیا کہ ان کے پاس اسبابِ ھدایت موجود تھا مگر ہدایت نہ پائی۔ اگر کسی مسلمان کے پاس

اسبابِ ہدایت ہو اور وہ ہدایت نہ پائے تو بدبختی ہے۔
اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے دو مثالیں بیان کیں۔ ایک مائی۔ دوسری ناری۔ منافقوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ آنکھ دیکھی جیسا بیان کرنا چاہتا ہے۔ مثلہم کمثل الذی استوقد نارا فلما اضاءت۔ مثال ایک ضروری چیز ہے۔ کیونکہ مثال سے بات دماغ میں جلدی بیٹھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی روشنی کی مثال آگ سے دی۔ مثال کی بات یہ نہیں کہ وہ بالکل اسی طرح ہو۔ مثلاً جس طرح ہم بہادر آدمی کو شیر کہتے ہیں وہ کوئی خود شیر تو نہیں ہوتا۔ بجلی تو اب ایجاد ہوئی ہے۔ قدیم زمانہ میں رات کو روشنی کیلئے آگ اور دن کو سورج ہوتا تھا۔ یہ سورج قیامت سے پہلے تک روشن رہے گا۔ قیامت کے بعد چاند، سورج، تاروں کی روشنی نہوگی۔ یہ مادی چیزیں ہیں ان کی روشنی ختم ہو جائیگی۔ صرف عمل کی روشنی رہیگی۔ جس قدر مسلمان کے پاس ایمان و عمل ہوگا اسقدر اسکے پاس روشنی ہوگی۔ کافروں کے عمل کے مطابق تاریکی ہوگی۔ قبر میں بھی یہی حال ہوگا کہ وہاں بھی ایمان و عمل کے مطابق روشنی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت میں جب مومن چلیں گے تو منافق بول اٹھیں گے کہ تم کچھ دیر تو ٹھرو تاکہ ہم بھی تمہاری روشنی میں چلیں۔ قرآن۔ بسورۂ باب، تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان ایک چیز حائل کردیگا جس سے وہ منافق مسلمانوں کی روشنی نہ پاسکیں گے۔ تو آگ

کو ایمان سے تشبیہ دیگئی۔ آگ روشن ہے اسی طرح ایمان میں بھی روشنی ہے۔ ہر روشنی میں آتشی اسباب ہیں۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے ایک جگہ یہ قاعدہ بدل دیا ہے تاکہ اللہ تعالےٰ کی قدرت ظاہر ہو۔ وہ صرف جگنو کی روشنی ہے۔ اسکی روشنی کو آگ کے بغیر بنایا۔ غالباً اس میں ناریت اس لئے نہیں رکھی کہ اگر وہ کسی کے کپڑے پر بیٹھ جائے تو کپڑوں میں آگ نہ لگے۔ واللہ اعلم۔ تو اللہ تعالےٰ کی قدرت کو اپنی عقل کے تنگ دائرہ میں نہ رکھو اسکی قدرت تو بہت بالا تر ہے۔ مقامِ آخرت میں اسکی قدرت دیکھنا۔ اور تشبیہ دی کہ آگ میں روشنی ہے اور جب آدمی میں روشنی آجائے تو اس میں بہت بڑا انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً روشنی ہو تو انسان میں امتیازِ اشیاء پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی چیزوں کی پہچان ہو جاتی ہے۔ کہ یہ سانپ ہے اور وہ رسی وغیرہ ہے۔ تو ایمان کی روشنی سے بھی امتیازی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ فلاں حق ہے اور فلاں باطل ہے۔ اور آگ کے اندر گرمی ہے ایمان سے اللہ کی محبت کی گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو انسان میں ایمان سے پہلے نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ ایمان کے بعد اللہ پر سب کچھ قربان کرتا ہے۔ آگ میں دوسری چیز یہ ہے کہ دوسری چیز کو اپنی طرف منتقل کرتی ہے۔ مثلاً لکڑی میں آگ نہیں مگر آگ میں ڈالو تو لکڑی کو شعلہ بنا دیگی۔ تو گویا آگ شرک برداشت نہیں کرتی۔ تو ایمان کی بھی یہی حقیقت

ہونی چاہیئے کہ جب اللہ تعالےٰ سے ایمان ہو گیا تو غیر اللہ سے نفرت ہونی چاہیئے۔ یعنی غیروں سے بے نیازی ہو۔ تو ایمان کی آگ نے ہمیں اللہ کے مطابق بنایا بعینہ ایسے جس طرح آگ نے لکڑی کو اپنے مطابق بنایا۔

حضرت بالول رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیسے گزرتی ہے۔ فرمایا دنیا میں میری مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں ہوتا۔ تو اس نے کہا کہ یہ تو خدائی کا دعوٰی ہے۔ فرمایا نہیں بلکہ بندگی کا دعوٰی ہے۔ کیونکہ میں نے اپنی رضا کو اللہ کی رضا پر مٹا دیا ہے۔ اب اللہ تعالےٰ جو کام کرتا ہے وہ میری مرضی کے مطابق کرتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص کے گھوڑے کو عادت تھی کہ وہ اپنی مرضی سے جدھر چاہتا چلتا تھا۔ تو گھوڑا جس طرف پھرتا تو وہ کہتا کہ چلو اس طرف بھی میرا کام ہے۔ اور کہتا تو جس طرف پھرتا رہے اس طرف میرا کام ہے۔ تو ہمیں بھی اللہ کی مرضی پر رضامند ہونا چاہیے۔ اللہ تعالےٰ جس طرف چلائیں اسی طرف چلیں۔ اللہ تعالےٰ تجارتِ آخرت پر لگائے۔

درس نمبر ۲۶
16 دسمبر 1966ء

نارِی مثال

مثلہم کمثل الذی استوقد نارا۔ منافقوں کے بیان میں ناری یعنی آگ کی مثال دیگئی تھی۔ اللہ تعالےٰ مطالب سمجھانے میں ہمیشہ کثرت کا خیال کرتا ہے۔ اسلام کی مثال بجلی سے بھی دے سکتا تھا لیکن قرآن جس زمانے میں نازل ہوا وہ لوگ بجلی کو نہیں جانتے تھے۔ اللہ تعالےٰ چونکہ عام لوگوں کو سمجھانا زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس لیے دین کی مثال آگ سے یعنی ناری مثال دی۔ آپ کہیں گے کہ اللہ تعالےٰ نے شمسی و قمری مثال کیوں نہ دی۔ انھیں بجلی معلوم نہیں تھی۔ مگر وہ چاند، سورج کو تو بخوبی جانتے تھے۔ دیکھو سورج اور چاند انسان کے بس سے خارج ہیں اس لیے ان کی مثال دینا درست نہیں تھا۔ مگر آگ انسان کے بس میں ہے جب چاہیں بجھائیں جب چاہیں جلائیں۔ مثال صرف اس پہلو میں جاتی ہے جو مثال دی ہوئی چیز کیساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ اس کی یہ صورت فرض کیگئی کہ

جنگلات میں رہنے والے کو شہری سے زیادہ قدر ہوتی ہے۔ ومتاع

للمقوین۔ اور یہ آگ جنگل والوں کے فائدہ کے لئے ہے۔ اور اگر جنگل کی زندگی میں صرف آگ ہو اور آگ کسی مقصد کے تحت جلاتے ہیں ۔ اس میں منافقوں کی حالت کی مثال یہ ہوئی کہ جو آدمی نفاق برستا ہے وہ نفاق چاہے اعتقادی ہو کہ دل میں کفر اور زبان پر ایمان کا اظہار ہو اور یا عملی نفاق ہو کہ دین کے کام کو دنیا کے مقصد کیلئے کرنا۔ یہ ایسی مثال ہے کہ آگ ابھی بھڑکی اور بجھی۔ آگے نہ جائے گی۔

وترکھم فی ظلمت لا یبصرون۔ کہ انہیں اندھیرے میں چھوڑ دے گا وہ نہ دیکھ سکیں گے۔ تو اگر اعمال دنیاوی مقصد کیلئے کئے۔ تو دنیا کے ساتھ ایسے اعمال بھی فناہ ہو جائیں گے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کے لئے کیے۔ تو خدا تعالیٰ باقی ہیں تو اعمال بھی باقی ہیں۔

تو اگر اخلاص سے عمل کیا تو وہ پختہ اور پائیدار ہو گا۔

(قرآن میں ہے کہ ہم نے آگ کو اس لئے بنایا تاکہ جہنم کی آگ یاد رہے۔)

(حدیث شریف میں ہے کہ دنیا کی آگ جہنم کی آگ کا سوواں، 100، حصہ ہے)

منافقوں کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ منافق اکثر امیر لوگ تھے۔ غریب میں نفاق نہیں۔ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں ان کا مرید کچھ آم لایا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے کہہ

نہیں رکھا کہ مجھ سے پوچھ کر ہدیہ دیا کرو۔ آپ چونکہ بغیر اجازت لائے ہیں تو اس لئے یہ قبول نہیں۔ تو انہیں اس مسجد سے نکال دیا تو وہ دوسری مسجد میں بھی جا کر روتا رہا تھا۔ اسے بلوایا تو اس نے کہا کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے اب یہ واپس تو نہیں جاسکتے اب کیا کروں تو حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تدبیر میرے ذمے تو نہیں کہ آپ بیوقوفی کریں اور میں تدبیر بتلاؤں تو آخر مہربانی کی فرمایا ان کو بیچ دو اور پیسے لے کر چلے جاؤ۔ ایک مسئلہ یاد آگیا کہ کچھ لوگوں کو اللہ تعالےٰ اپنی حکمت کے تحت شرعی اور دنیاوی کاموں کیلئے مقرر کرتا ہے مگر تصرف اللہ تعالےٰ کا ہوتا ہے۔ انہیں صاحبِ تکوین یا صاحبِ خدمت کہتے ہیں۔ ان میں جو شریعت کے کام کریں انہیں صاحب یا مجذوب تشریعی کہتے ہیں اور جو دنیا کے کام کریں انہیں صاحب یا مجذوب تکوینی کہتے ہیں۔ کہتے ہیں حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ مجذوبِ تشریعی تھے۔ اللہ تعالےٰ نے ان سے شریعت کا بہت سا کام لیا ہے۔

ایک مرتبہ آپ مجلس میں تشریف فرما تھے ایک ناخواندہ کسان آیا اس نے ایک اکنی پھینک کر کہا مولبی جی یہ ایک اکنی ہے اس میں سے ایک پیسہ لیکر تین پیسے مجھے واپس کردو۔ کچھ لوگوں نے اعتراض کیا مگر حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کے اخلاص کی وجہ سے میں لے رہا ہوں۔

تو صاحب یا مجذوبِ تکوینی کا ذکر چل رہا تھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے زمانے میں طلبا نے عرض کی حضرت دہلی کی حالت خراب ہے، مسجدیں ویران ہیں، سینما آباد ہیں، خیرات میں کافی کمی آگئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجذوب تکوینی بہت سست آدمی ہے۔ طلبا کے اصرار پر بتایا کہ فلاں بازار میں خربوزے بیچنے والا بوڑھا وقت کا صاحب تکوین ہے۔ طلبا گئے چند خربوزے کاٹتے گئے اور کہتے گئے کہ یہ پھیکے ہیں صرف ایک میٹھا نکلا اس کے پیسے دیے اور لوٹ آئے اس نے کاٹے گئے خربوزوں کے پیسے نہ مانگے تو طلبا نے آکر کہا کہ واقعی سست ہے جسے اپنے خربوزوں کا خیال نہیں وہ دہلی کا کیا خیال رکھے گا کچھ عرصہ بعد دہلی کی حالت درست ہو گئی طلبا نے کہا کہ اب تو مسجدیں آباد ہیں۔ مدرسہ میں خیرات بھی بہت آتی ہے آپ نے فرمایا صاحب تکوین بہت سخت ہے۔ تو طلبا کے اصرار پر فرمایا کہ فلاں بازار میں پانی کا گلاس بیچ رہا ہے۔ طلبا چلے گئے دیکھا واقعی ایک شخص ایک پیسے گلاس بیچ رہا ہے۔ اسے ایک پیسہ دے کر ایک گلاس لیا اس میں قدرتاً ایک تنکا تھا طالبعلم نے اسے ڈول دیا اور دوسرا گلاس طلب کیا تو مجذوب نے کہا کہ پہلے دوسرا پیسہ دو پھر گلاس ملے گا یہ کوئی خربوزے بیچنے والا نہیں۔ یہ بات سنتے ہی طالبعلم وہاں سے جلدی واپس لوٹ آئے اور آکر حضرت جی کو سارا حال سنایا اور کہا کہ

واقعی سخت ہے۔

منافقین کا ذکر چل رہا تھا کہ منافقوں کی تعداد مال دار لوگوں کی تھی۔ مالدار دنیا کے کتے ہیں اس لئے انہیں حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا فیض نہیں پہنچا۔

حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم فقراء سے مہربانی فرماتے تھے۔ حدیث شریف ہے کہ مالدار سے غرباء جنت میں پہلے جائیں گے۔ اگر غنی اور فقیر کی نیکی برابر بھی ہو گی تو تب بھی اللہ تعالےٰ امیر کو روک لیں گے اور غریب کو جنت میں داخل کریں گے ۔ امیر غریب سے پانچ سو سال بعد میں جنت میں جائے گا۔ دین کا معاملہ عجیب ہے کہ امراء کے لیے کلام کا لہجہ سخت استعمال کیا گیا ہے ایک مرتبہ حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم مکہ کے رؤسا کو ہدایت کر رہے تھے منافق بھی موجود تھے۔ حضرت عبداللہ ابنؓ ام مکتوم صحابی جو نابینا تھے۔ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ آپ تبلیغ فرما رہے ہیں یا کہ فارغ ہو چکے ہیں۔ انہیں ایک مسئلہ کی درکار تھی تو انھوں نے اونچی آواز میں کہا کہ مجھے ایک مسئلہ دریافت کرنا ہے تو اس پر حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم کچھ ترش رو ہوئے کہ یہ تو مسلمان ہے بعد میں پوچھ لیتا یہ تو دین کی تبلیغ دبجا رہی تھی۔ تو اس غریب کی بات عرش پر پہنچی تو اس ضمن میں پوری سورت عبس و تولی ان جاءہ الا عمی۔ نازل ہوئی اس واقعہ کا حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایسا اثر

ہوا کہ جب یہ نابینا صحابیؓ آپکی خدمت اقدس میں آتے تو آپ فرماتے تھے کہ خوش آمدید ہووہ غریب صحابیؓ کہ جس کی وجہ سے اللہ تعالےٰ نے مجھے ڈانٹ دی۔ بہت سے غزوات میں آپ نے اس غریب صحابیؓ کو اپنا جانشین بھی بنایا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے غریب کی تبلیغ پر امیر کی تبلیغ کو ترجیح دی۔ اگر یہ بات درست تھی تو اللہ تعالےٰ نے ڈانٹ کیوں دی۔ اور اگر یہ بات غلط تھی تو آپ سے یہ کیسے غلطی ہوئی۔ الجواب۔ کہ آپ امیر کی تبلیغ میں متوجہ ہوئے وہ اس کی دنیاداری کیوجہ سے نہ تھی۔ صحیحین کی حدیث ہے کہ ایک امیر آدمی آپ کی مجلس میں آیا آپنے پوچھا یہ کون ہے۔ عرض کیگئی کہ اس سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ یہ بات کرے تو لوگ سنتے ہیں وغیرہ یعنی دولتمند ہے۔ اس کے بعد دوسرا شخص گزرا جس کے کپڑے پھٹے پرانے تھے وغیرہ تو آپ نے فرمایا خدا تعالےٰ کے ہاں اس کا بلند مرتبہ ہے۔ تو آپکی سیرت بتلاتی ہے کہ آپ امراء سے محبت نہیں رکھتے تھے۔ تو کفار کی تبلیغ ایک اہم چیز ہے اور اسکے مقابلے میں ایک مسلمان کو مسئلہ بتلانا کم اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ آپ تو حکیم تھے آپ نے دونوں کے مقاصد کو تولا۔ اسکی مثال ایسی ہے کہ ایک ڈاکٹر کے پاس دو آدمی آئیں ایک کہے کہ میرے والد کو دل کا دورہ ہے دوسرا کہے کہ نزلہ وزکام ہے تو عقلمند کیلئے ضروری

ہے کہ دل کے دورے والے کے ہاں جائے۔ تو کفار کو قلب کی مرض تھی تو معلوم ہوا کہ حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے معقول اور بر محل کام کیا۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ڈانٹ کیوں دی۔ اللہ کی ڈانٹ اور اصول کے تحت تھی۔ اللہ کو بھی معلوم تھا کہ معقول کام ہے مگر ایک اور اصول بھی ہے۔ کہ طالبِ علاج کا علاج اس شخص کے علاج سے مقدم ہے جو منکر العلاج ہو۔ اور یہ غائب کی بات ہے جسے صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے کہ قلب کے دورے والے نے اطلاع تو دے دی کہ قلب کا دورہ ہے اور علاج کا خواہاں نہیں۔ مگر زکام والا طبیب کا معتقد ہے اور علاج کا خواہاں بھی ہے۔ تو اس وقت عقلمند ضرور زکام والے کی طرف توجہ دے گا۔ اور یہ بات اللہ کو معلوم تھی اس لئے ایسے الفاظ استعمال فرمائے۔ فاما من استغنیٰ فانت لہٗ تصدّیٰ کہ جو علاج سے بے پرواہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی ڈانٹ اور آپ کا معقول فعل ہونا دونوں درست ہوئے۔ جب حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا گرامی نامہ روم کے بادشاہ ھرقل کے پاس گیا تو اس نے دحیہ القلبی سے ایک سوال کیا۔ کہ تمہارے نبی پر غریب ایمان لائے ہیں یا مالدار۔ کہا غریب لوگ تو بادشاہ نے کہا وہ واقعی نبی ہے۔ کیونکہ پیغمبروں پر غریب زیادہ ایمان لاتے ہیں۔ جب حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم چھا گئے تو پھر مالدار مسلمان ہونے لگے۔ اب بھی دیکھو

غریب بڑی بڑی انجمنیں کھولتے ہیں تو جب امراء دیکھتے ہیں کہ یہ غریب چھا گئے ہیں تو پھر مل کر قبضہ کر لیتے ہیں۔

اقبال:۔

سالہا اندر جہاں گر دیدہ ام ۔
نم بچشم منعماں کم دیدہ ام۔

چین تک اسلام غرباء کی وجہ سے پھیلا۔

اگر جہاں میں میرا جوہر آشکار ہوا ۔
قلندری سے ہوا ہے سکندری سے نہیں۔

حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک غریب صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ کی بہت تعریف فرمائی ہے۔ فرمایا آسمان کے نیچے ابوذر غفاریؓ سے سچا اور کوئی نہیں۔ حضرت ابو ذر غفاری کا ایک غلام تھا اس سے کوئی غلطی ہوئی تو حضرت ابوذر غفاری کی زبان سے نکلا اے کالی ماں کے بیٹے۔ تو یہ بات آپ تک جا پہنچی فرمایا ان امرأ فیک جاہلیتہ کہ ابوذر تیرے اندر کفار والے آثار باقی ہیں۔ تو ہم تو نہ تھے وہ ابوذرؓ تھے افسوس کیا اور غلام آزاد کر دیا۔ اور موت تک روتے رہے کہ بخشا جاؤں۔

احیاء العلوم کے آخری باب میں نقل ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی تعریف فرمائی۔ لو کان النبیّ من بعدی لکان عمر۔ کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا۔ مگر پیغمبری کا

دروازہ بند ہو گیا ہے۔ مگر آج پیغمبری کا دعویٰ وہ لوگ کرتے ہیں جنہوں نے ساری عمر انگریزوں کے بوٹ چاٹے۔

حضرت عمر نے دس سال خلافت کی۔ شبلی کی الفاروق میں ہے کہ آپ نے 22 لاکھ 55 ہزار مربع میل علاقہ فتح کیا جو اب بھی مسلمانوں کے پاس ہے۔ آج کل جو بیت اللہ کا حج نہ کرنے والا اور قرآن کو حفظ نہ کرنے والا ہے مگر دعویٰ نبوت کا کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو مغیرہؓ بن شعبہ کے غلام ابو لؤلؤ نے عین نماز کی حالت میں خنجر مار کر شہید کر دیا۔ حدیث پاک میں ہے کہ حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک دن جبرائیل آیا اور کہا کہ اسلام عمرؓ کی وفات پر ضرور روئے گا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اگر دس برس اور زندہ رہتے تو کرہ ارض پر کافر کا وجود نہ ہوتا۔ مگر آج ہمارے بھی صدر ہیں، جو حرام خور و شراب خور ہیں۔ منافقوں کیلئے آگ کی مثال کا بیان تھا۔ ،،مائی مثال،، یعنی پانی کی مثال پر بعد میں بیان کرونگا۔ یہ رمضان شریف کا مہینہ ہے آگ کی مثال کا اس مہینہ سے خاص تعلق ہے۔ آگ کی مثال اس وجہ سے بھی درست ہے کہ ایمان اللہ تعالیٰ سے عشق اور محبت کی آگ کا نام ہے۔ یہ عشق کی طرح کہ صرف معشوق یاد رہتا ہے اور باقی سب کو جلاتی ہے۔ یہ عشق اور محبت کی آگ رمضان کے روزے سے اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ اور اس روزے سے منافق اور مسلمان کا فرق معلوم ہوتا

ہے۔ روزہ ایک مخصوص عبادت ہے اس ماہ میں حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حالت تبدیل ہو جاتی تھی۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔

کان رسول اللہ علیہ وسلم اجودالناس وکان اجود فی رمضان حین یلقاہ جبرائیل وکان یلقاہ کل لیلتہ یدار القرآن فلھوا جود من الریح المرسلتہ۔ کہ تمام کرہ ارضی کے لوگوں کی سخاوت حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سخاوت سے کم ہے۔ اور رمضان میں تو آپکی سخاوت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ اور ہر رات جبرائیل قرآن کا دور کرتے تھے۔ اور فرمایا کہ ہوا سے بھی جو بادل اڑالاتی ہے آپکی سخاوت بڑھ جاتی تھی۔

حدیث قدسی ہے۔ کل عمل بنی آدم لہ الاالصوم۔ ہر عمل بنی آدم کیلئے ہے مگر روزہ میرے لئے ہے۔ تو بات یہ ہے کہ ہر ملک کا ضابطہ علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح بازار آخرت میں جو ضابطہ وقانون ہے۔ فیصلہ اسی کے مطابق ہوگا۔ باقی روزہ یہ مجھ پر چھوڑو اس کا بدلہ میں اپنی طرف سے مقرر کر کے دونگا۔

حدیث قدسی ہے۔ الصوم جنتہ۔ کہ روزہ جہنم کیلئے ڈھال ہے۔ کیونکہ مرد نے بھوک، پیاس، اور بیوی کی آگ کا مقابلہ روزہ سے کیا۔ تو اس لئے اللہ تعالےٰ نے جہنم کی آگ سے بچایا۔ والذی بنفس محمدی کہ قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے ہاتھ میں میری

زندگی ہے کہ روزہ دار کے منہ کی خوشبو اللہ تعالیٰ کو کستوری سے زیادہ پسند ہے۔ روزہ دار کو دو خوشیاں ہیں۔ ایک جب روزہ کھولتا ہے۔ اور دوسری خوشی تب ہوگی جب اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ تو جو آدمی روزہ رکھے گا تو اس کیلئے افطار تو ضروری ہے۔ تو اللہ تعالیٰ یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ جس طرح افطاری آنا لازمی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا دیدار بھی لازمی ہے۔

درس نمبر۲۷
18دسمبر1966ء

مائی مثال

منافقین کے سلسلے میں دوسری مثال مائی دیگئی ہے۔
او کصیب من السماء فیہ۔
صیب۔ کو عربی میں زور سے برسنے والی بارش کو کہتے ہیں۔ رعد و گرج۔ وہ آواز جو بادل سے نکلتی ہے۔ برق، بجلی کی چمک، صواعق کہ جس پر پڑے اسے ختم کر دیتی ہے۔ یخطف یعنی اچک [illegible] سے چھین لینا۔ باقی مفردات ظاہر ہیں۔
لفظی ترجمہ:۔ کہ منافقوں کی حالت ایسی ہے جیسی ایک زور دار بارش کی حالت ہوتی ہے۔ جو آسمان کیطرف سے زور سے برس رہی ہو اور اس کے ساتھ گرج اور بجلی بھی ہو۔ پھر بارش کے دوران لوگوں نے موت کے ڈر سے کانوں میں انگلی ڈالی ہو۔ یعنی خوف کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقوں پر پورا احاطہ ڈالا ہے۔ جب بجلی آتی ہے تو چلتے ہیں اور جب ختم تو ٹھر جاتے ہیں۔
تو دوسری مثال مائی ہوئی۔ یعنی پانی کی مثال۔ آگے چل کر

معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی وحی کی مثال پانی کی طرح ہے۔ تو جس طرح بارش سے لوگوں کا تعلق ہے۔ یعنی بارش کے پانی سے۔ تو ان لوگوں کی حالت وحی سے یہی ہے۔ یعنی اسیطرح ہے۔ پانی کی چند صفتیں ہیں (1) کہ پانی ذریعہ حیات ہے۔ اگر پانی نہو تو کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پانی دنیا کی زندگی کا ذریعہ ہے۔ وجعلنا من الماء کل شئی حی۔ (1) کہ پانی سے ہر چیز کو زندگی بخشی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحی بھی ذریعہ حیات ہے۔ دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی جو لامحدود زندگی ہے اور آگے آنے والی ہے۔ ان دونوں کا ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ حقیقت میں دنیاوی زندگی میں بھی دین سے جان پڑتی ہے۔ فلنحیینہ حیوۃً طیبۃً۔ جس کے قلب میں نور ایمان ہے اسکی زندگی عمدہ گزرتی ہے۔ آپ ایک درویش کی زندگی دیکھیں جو صدر امریکہ کی زندگی سے نہائیت عمدہ ہو گئی۔ تو معلوم ہو گیا کہ قبر و آخرت تو ہے ہی دین سے وابستہ مگر دنیا کی زندگی بھی دین سے وابستہ ہے۔ تو وحی دونوں زندگیوں کا ذریعہ ہے۔

(2) پانی کی دوسری خاصیت یہ ہے کہ وہ پوشیدہ طاقت کو کھولتا ہے۔ مثلاً ہمیں یہ معلوم نہیں کہ زمین میں کیا ہے۔ مگر جب بارش برسی پانی پڑا تو جو تخم اس میں پوشیدہ ہے اس کا پودا نکل آیا۔ مطلب یہ کہ اگر پانی اور بارش نہوتی تو ہمیں زمین کی اندرونی

طاقت کا پتہ نہ چلتا۔

(3) پانی کی تیسری صفت یہ ہے کہ پانی عموماً پستی پسند ہے۔ نشیبی زمین میں جاتا ہے پانی کی گویا ایک صفت یہ ہے کہ اس کا میلان پستی کی طرف ہے بلندی کی طرف نہیں۔ اگر مشین سے مجبوراً چڑھائیں تو اور بات ہے۔

(4) پانی کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ آگ کا دشمن ہے اور یقینی بات ہے جو پانی آگ نہ بجھائے وہ پانی نہیں۔

(5) پانی کی پانچویں صفت یہ ہے کہ پانی موجبِ رِقت ہے۔ یعنی نرمی پیدا کرنے والی چیز ہے۔ سختی کو نرمی میں تبدیل کرتا ہے۔ میدانی ایک عالم گزرے ہیں انہوں نے ضرب القرآن پر ایک کتاب لکھی یعنی قرآن کی مثال کی کتاب۔ جو آج کل ملتی نہیں نایاب ہے۔ آج مسلمان دین سے اتنا غافل ہو گیا ہے کہ کتابیں ختم ہوتی جاتی ہیں۔ بہرحال جو کچھ میں نے بیان کیا ہے یہ مضمون ان کتابوں میں جو قرآن کے متعلق یعنی تفسیروں وغیرہ میں نہیں جو مشرقی اور مغربی پاکستان میں چھپی ہیں۔ بلکہ مکہ شریف میں میدانی کے حوالہ سے دیکھی تھیں۔

مکہ شریف کے کتب خانہ میں کشف الظنون نامی قلمی کتاب دیکھی۔ جو سات سو جلدوں پر مشتمل تھی جبکہ ایک جلد ہزار صفحہ کی تھی۔ صرف بسم اللہ پر پچیس جلدیں تھیں۔ اس کے مصنف عبد

السلام قزوینی ہیں۔ یہ مقام ترکی اور ایران کی سرحد پر ہے۔ دیکھو سات سو جلدیں قلمی تحریر ہوئی پڑی ہیں۔ یہ ہمارے زمانے کے مصنف کی طرح نہیں جو صرف اردو جانتا ہے اور قلم اٹھا کر پچھلے لوگوں کو گالی دینا شروع کر دیتا ہے۔ یعنی مفسرین کرام کو۔ اسکی لکھی گئی تمام تفاسیر شیطان کی تفاسیر ہیں۔ تو اس کشف الظنون کی آخری جلد دیکھی۔ ایسی عمدہ لکھی گئی ہے کہ سبحان اللہ۔ علامہ قزوینی آخیر میں یوں لکھتے ہیں کہ یا اللہ تیرا قرآن ایک بے کنار سمندر ہے۔اس غریب نے ایک غوطہ لگایا ہے جو چند موتی ہاتھ آئے وہ غریب نے لکھے باقی نہیں لکھ سکا۔ تو علامہ قزوینی نے لکھا کہ پانی کی تمام خاصیتیں وحی میں پائی جاتی ہیں۔1۔ کہ وحی الہی جو ہے وہ ابدی زندگی کا ذریعہ ہے وحی کی دو قسمیں ہیں (1) وحی متلو۔ کہ جس وحی میں کلام اور عبارت دونوں خدا تعالیٰ کی ہوں۔ (2) وحی حدیث۔ کہ جس میں بات خدا تعالیٰ کی اور کلام حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ہو۔ دیکھو اگر کمشنر کو اس کا سیکٹری گورنر کا پیغام دے کہ فلاں تاریخ کو بذریعہ خیبر میل آپ نے گورنر صاحب کے ساتھ لاہور جانا ہے۔ اب اگر وہ سیکٹری گورنر والے الفاظ دہرائے یا اپنی ہی عبارت میں کہہ دے دونوں صورتوں میں حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ قرآن وحدیث میں بھی یہی معاملہ ہے۔ قرآن پیغام خدا ہے بالفاظِ خدا۔ اور حدیث مضمون خدا ہے بالفاظ رسول

خدا صلے اللہ علیہ و سلم۔ ایسا عمل پوری دنیا میں ہو رہا ہے۔ کہ یہ تو کوئی نہیں پوچھتا کہ سیکٹری صاحب گورنر صاحب کے الفاظ بھی یہی ہیں یا وہ کچھ اور تھے۔ روزمرہ زندگی کی تہذیب اور تمدن میں یہ ہو رہا ہے۔ کہ بولنے والے کی منشاء ادا ہو جائے۔ چاہے الفاظ وہی ہوں یا نہ۔ تو قرآن کلام خدا بالفاظ خدا ہوا اور حدیث کلام خدا بالفاظ رسول صلے اللہ علیہ و سلم ہوئی۔ احادیث مبارک کی تعداد سات لاکھ پچاس ہزار ہے۔ اگر یہاں بھی پیغام خدا بالفاظ خدا ہوتا۔ تو وہ بھی قرآن ہوتا۔ تو ہم مسلمان تراویح میں قرآن کیسے ختم کر سکتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام فرمایا کہ جو نہایت اہم مضامین ہیں انہیں قرآن میں مختصر ذکر کر دیا۔ اور اسکی ضروری تشریح حدیث پاک میں کر دی۔ اگر ایسا نہوتا تو کرہ ارضی پر ایک حافظ بھی موجود نہ ہوتا اور تحریف شروع ہو جاتی۔ تو اس لیے مہمات دین قرآن میں ذکر کر دیں تاکہ امت کیلئے قرآن کا حفظ آسان ہو اور اسکی وضاحت حدیث پاک میں کر دی۔ تو قرآن کے ایک ایک حرف پر دس نیکیاں ہیں۔ تو معلوم ہو گیا کہ قرآن کے الفاظ اور کلام دونوں محفوظ ہیں۔ اور حدیث پاک سے کلام خدا کا مطلب واضح کر دیا۔ اگر آپ کہیں کہ قرآنی الفاظ کے معانی پڑھا دیا کریں۔ دیکھو اگر لفظی معنی آتا ہو تو یہ نور علی نور ہے۔ اور اگر آپ صرف ترجمہ پر اکتفاء کرنا چاہیں تو پھر ایک ایک لفظ کے بدلے دس دس نیکیاں تو نہیں ملیں گی۔ تو یہ تو غلط خیال

ہے۔ تو وحی الٰہی حیات کا ذریعہ ہے۔

(2) یہ کہ پانی پوشیدہ جگہ یعنی زمین سے آتا ہے۔ اسطرح وحی کی بارش بھی شروع میں جب مکہ شریف میں برسی اور بعد میں مدینہ شریف میں برسی۔ اور یہ بارش قلوب کی زمین پر برسی۔ ایک دل ابوبکر صدیقؓ کا تھا۔ اور اسیطرح حضرت فاروق اعظمؓ کا دل اور حضرت عثمان غنیؓ کا دل اور حضرت علیؓ کا دل تھا۔ یعنی صحابہ کرامؓ کے قلوب پر وحی کی بارش برسی۔ ان کے قلوب میں جو نیک اعمال کے تخم تھے وہ ابھر آئے۔

اور دوسری طرف ابوجہل و ابولہب وغیرہ پر برسی تو ان کے قلوب میں جو کفر اور دین الٰہی کی دشمنی کے جو تخم تھے وہ نکلے۔ بصورت جنگ بدر واحد نکلے تو یہ تخم پوشیدہ تھا۔ اگر قرآن کی وحی نہ ہوتی تو ان کا پتہ کیسے چلتا۔ اس وقت مرزائیوں کی کل تعداد دو لاکھ ہے۔ ایک نے کہا کتنے مرتد ہو گئے۔ میں نے کہا جو لوگ مرتد ہوئے ہیں۔ ان کے قلوب میں تخم ضلالت پہلے سے ہی موجود تھا۔ اور اب جا کر ظاہر ہوا۔ اب دیکھیں کہ یہی وحی قرآن۔ وننزل من القرآن ما ھو شفاء۔ کہ قرآن سے وہ چیز نکالتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفاء ہے۔ لیکن ظالموں کے لیے گمراہی بنتا ہے۔ یضل بہ کثیرا ویھدی بہ کثیرا۔ کہ اس سے بہتوں کو ہدایت اور بہتوں کو گمراہی ہوتی ہے۔ تو جہاں عمدہ تخم ہو گا وہاں ایمان کا عمدہ پودا نکلے گا۔ اور

جہاں گندہ تخم ہوگا وہاں کفر کا گندہ پودا نکلے گا۔ دیکھو بعض مومن ہیں کہ دین کے معاملے میں چستی سے کام لیتے ہیں۔ اور بعض مومن سستی سے کام لیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جیسا تخم ہوگا ویسا پودا نکلے گا۔

(3) چیز یہ کہ پانی کا میلان پستی کی طرف ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوگیا کہ قلوب کی زمین کی سطح میں فرق ہے۔ کوئی بلند ہیں جس طرح غرور اور تکبر والے کا قلب۔ کہ جس طرح اونچی جگہ پر پانی اثر نہیں کرتا اسی طرح تکبر بھرے قلب پر وحی بھی اثر نہیں کرتی اور جو قلب متواضع ہو، پست ہو تو وحی الٰہی اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ حدیث قدسی ہے۔ انا عندالمنکسرۃ قلوبھم۔ اللہ تعالے فرماتے ہیں کہ میرے بندوں کو پیغام دیدو کہ میں ان دلوں میں پہنچ جاتا ہوں جہاں تواضع ہو۔

اس تکبر کی وجہ سے مسلمانوں کا اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اتحاد کیلئے تکبر توڑنا ضروری ہے۔ یہود کا کانٹا عرب کے سینہ میں ہے۔ مگر اتفاق واتحاد نہیں ۔ ناصر کہتا ہے کہ علاقے کا بڑا میں بنوں۔ اسیطرح فیصل اور شاہ اردن بھی خواہش رکھتے ہیں۔ فبما رحمۃ اللہ لنت لھم۔ آپ صحابہؓ کیلئے نرم ہوتے ہیں۔

(4) پانی آگ کا دشمن ہے۔ دیکھیں شرع کے خلاف جو خواہشات نفسی ہیں یہ سب آگ ہیں۔ شیخ اکبر فتوحات مکیہ میں لکھتے ہیں کہ ہر گناہ آگ ہے۔ اور آتشی مواد کو جہنم میں جمع کر دیا۔ جس

طرح انسان نے آتشی مواد اکٹھا کر کے بم وغیرہ بنائے۔ اسی طرح گناہوں کا مواد جہنم میں جمع ہو گیا۔ جہاں وحی الہی اس آگ کے لیے پانی کا کام دیتی ہے۔ تو دیکھو پانی موجود ہے مگر خواہشات کی آگ نہیں بجھتی۔ جواب یہ کہ یہ وعدہ حقیقی آگ کیساتھ ہے۔ اگر تھوڑے کم درجہ کے گناہ ہو جائیں تو خود خدا تعالیٰ معاف کر دیتا ہے۔ التائب من الذنب کمن لاذنب لہ، آدمی اگر صدق دل سے معافی مانگے تو توبہ قبول ہو جاتی ہے۔ یہ بھی تو پانی ہوا۔ اللہ تعالیٰ صرف مشرک کو نہیں بخشے گا۔ ان اللہ لایغفران یشرک بہ، لیکن اگر ہمارا ایمان ظاہری ہو اور اصل میں نہ ہو۔ تو پھر یہ پانی آگ کو کس طرح بجھائے۔ دیکھو پٹرول وغیرہ پانی کی صورت میں ہے۔ مگر اسے آگ پر ڈالیں تو اور زیادہ بڑھے گی۔ تو معلوم ہو گیا کہ منافقوں کے پاس حقیقی پانی نہ تھا۔ بلکہ پٹرول تھا جس سے آگ اور زیادہ بڑھتی تھی۔ پانی نرمی کرتا ہے۔ اور وحی الہی میں بھی یہی اثر ہے۔ ثم تلین جلودھم و قلوبھم الی ذکر اللہ۔ کہ پھر مسلمانوں کی کھالیں اور قلوب قرآن سننے سے نرم پڑ جاتے ہیں۔ دیکھو جب قاری قرآن سناتا ہے تو مطلب سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ دل نرم ہو جاتا ہے۔ ام ایمن یہ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کی کنیز تھیں۔ انہوں نے بچپن میں آپکی پرورش کی تھی۔ کہتی ہیں کہ آپ روزانہ صحابہ کرامؓ کے ساتھ ان کی زیارت کیلئے ان

کے گھر تشریف لیجاتے۔ اور فرماتے میری ماں تو یہ ہیں۔ ہیں نے اپنی ماں کو تو نہیں دیکھا۔ حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات طیبہ کے بعد حضرت ابو بکرؓ صدیق اور حضرت فاروق اعظمؓ تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ آپ حضرت ام ایمن رو رہی ہیں۔ عرض کی رونے کا سبب کیا ہے؟ اگر کوئی معقول سبب ہے تو ہم بھی روئیں ورنہ رونے کی شکل تو بنا لیں۔ جواب فرماتی ہیں کہ حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے رو رہی ہوں۔

اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اپنے پاس بلایا ہے۔ کیا اللہ کے ہاں بہت عمدہ نعمتیں نہیں؟ فرمایا انقطع الوحی عن السماء فرمایا رونا اس بات کا ہے کہ خدا تعالیٰ کی کلام کا زمین پر آنا قیامت تک بند ہو گیا۔ تو اس پر دونوں حضرات زار و قطار رو پڑے۔

مگر آج تو گورداس پور کے ضلع میں نبی پیدا ہونے لگے ہیں۔ میں نے ایک رسالہ دیکھا ہے اس میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ۔ (مرزا غلام احمد قادیانی کو اچھا مانتے تھے) یہ خواجہ صاحب پر تہمت باندھی گئی ہے کہ وہ مرزا کے قائل تھے۔ دراصل بات یہ کہ عزیز اختر نامی شخص اوچ شریف کا رہنے والا تھا وہ منافقانہ طور پر حضرت خواجہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا مرید ہو گیا۔ اور ساتھ رہنے لگا حتی کہ خواجہ صاحب کا پسندیدہ ہو گیا۔ تو

اس نے ایک عربی میں خط لکھوایا اس پر حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مہر لگا کر مرزا کو دیدیا۔ یہ سب کام خفیہ طور پر ایک سازش کے تحت ہوا۔ اس میں لکھا تھا کہ ہم آپکو اچھا مانتے ہیں۔ یہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر سراسر بہتان ہے۔ اگر آپ اس مردود کو اچھا مانتے تھے تو پھر اس کے دست پر آپنے بیعت کیوں نہ کی؟ ختم نبوت کا جز آگیا ہے۔ دوسرے درس میں اس پر بیان ہو گا۔

درس نمبر ۲۸
23دسمبر1966ء

مُنافِقین پَر قرآن کا اثر

منافقوں کیلئے دوسری مثال مائی کا ذکر تھا۔ اسکی مناسبت وحی سے ہو چکی ہے۔ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی وجہ سے قرآن کی بارش ہوئی۔ ہر بارش کے ساتھ کچھ متعلق چیزیں ہوتی ہیں۔ منافقوں کے متعلق، قرآن کی بارش سے چار چیزیں نازل ہوئیں۔ ظلمت، رعد، برق، صواعق۔

ان میں دو چیزیں تو صیغہ جمع میں لائی گئیں۔ ظلمت، صواعق، اور رعد و برق صیغہ واحد میں لائے گئے۔ یہ نکتہ بعد میں بیان ہوگا۔ لیکن یہ تعیُّن کرنا پڑے گا کہ ظاہری بارش کے ساتھ یہ چیزیں روز مرہ مشاہدہ میں آتی ہیں۔ تاریکیاں بھی اور مابعد آیت کے فقرے رات کی بارش ہونیکے متعلق اشارہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ رات میں چلنا بجلی پر موقوف ہے۔

رات کی بارش میں تین قسم کی تاریکیاں ہوتی ہیں۔(1) بارش کی ظلمت یعنی تاریکی۔(2) رات کی

تاریکی۔ (3) اجتماعِ قطرات کی تاریکی۔ کہ تجربہ میں آیا ہے کہ اگر زور سے بارش ٹپکنے لگے تو تاریکی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے ظلمٰت، جمع کا صیغہ لایا گیا۔ اب رات کی بارش میں ایک طرف تو رحمت برس رہی ہے۔ کہ اگر بارش نہو تو پوری کائنات اجاڑ کھنڈر بن جائے۔ کائنات میں سب کی زندگی بارش سے وابستہ ہے۔ وھوالذی ینشر رحمتہ۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت یعنی (بارش) پھیلاتا ہے۔ تو قرآن میں متعدد جگہ بارش کو رحمت بیان کیا گیا۔ تو حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک سے اللہ تعالیٰ کی وحی کی بارش برسی۔ اس بارش سے منافقوں کے آگے کئی قسم کے ظلمٰت آگئے۔ کئی قسم کی تاریکیاں آگئیں۔ (1) تاریکی حب النفس، کہ اپنی ذات سے محبت کی تاریکی آگئی۔ (2) حب المال، کہ مال ودولت کی محبت کی تاریکی آگئی۔ (3) حب الجاہ، کہ عزت اور نام آوری کی محبت کی تاریکی آگئی۔ یہ تین قسم کی تاریکیاں ان کے سامنے آگئیں۔ اگر ہم قرآن کی بارش سے نفع اٹھاتے ہیں تو ہمارے راستے سے یہ تینوں تاریکیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ہمارا وجود اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اور اسے ہمیں کام کیلئے عطا کیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اپنے نفس سے تمہیں اتنی محبت ہو کہ اسے محفوظ رکھو۔ اور جس کام کیلئے دیا گیا ہے۔ اس سے وہ مقصد حاصل کرو۔ جس طرح پہلے زمانہ میں بادشاہ کسی کو گھوڑا دیتا کہ اس سے تم

فلاں کام لیا کرو۔ تو وہ اس کی خوراک کا انتظام بھی ضرور کریگا۔ اور اس سے متعین شدہ کام بھی لے گا۔ گھوڑا دیتے وقت اگرچہ بادشاہ نے اسے صاف الفاظ میں یہ نہ کہا ہو کہ اسے کھلایا پلایا کرو۔ مگر وہ پھر بھی اسے ضرور کھلائے پلائے گا۔

اسی طرح بدن کا گھوڑا آخرت کی فرمانبرداری کیلئے دیا گیا ہے۔ اور ضمنی طور پر یہ بھی فرما دیا گیا ہے کہ اسکی خوب خدمت کرو۔ حضرت عبداللہ ابن عاصیؓ مسلسل روزے رکھا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو۔ ان لنفسک علیک حقاً۔ کہ نفس کا تجھ پر حق ہے۔ یہ تیرا نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کا ہے۔ مسلسل عبادت سے یہ تھک جائیگا۔ وان لعینک علیک حقاوان لزوجک علیک حقا۔ اس کے بعد وہ صحابیؓ اس فرمان پر عمل کرنے لگے۔

اس حدیث پاک کی روشنی سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے وجود کو محفوظ رکھنا نیکی ہے۔ گویا تحفظ ذات یا نفس۔ یہ بھی نیکی ہے۔ اگر ہمارا وجود ختم ہو جائے تو عبادت اور نیکی کس طرح کریں گے۔ اتنی بات ہے کہ صرف وجود کی پرورش ہی نہ ہو بلکہ اس سے کام بھی لیا جائے۔ ورنہ اس کی مثال اس گھوڑے جیسی ہو گی۔ جو صرف کھاتا رہے اور کام نہ دے۔ تو ایسی صورت میں بادشاہ ناراض ہو گا اور سزا دیگا۔ جس طرح پہلی صورت میں کہ اس سے کام تو لے اور اسے کھلائے نہ۔ اس لئے خود کشی حرام ہے۔

بخاری کی حدیث ہے کہ آدمی جس آلہ سے خود کشی کرے گا دوزخ میں اسی آلہ سے خود کشی کرتا رہے گا۔ اسلام میں خود کشی حرام ہے اسلام میں دو باتیں ہیں - جب تک طاقت نہو تو خاموش رہو۔ جس طرح حضور پاک صلے اللہ علیہ وسلم مکہ میں تیرہ برس رہے۔ اور جب طاقت آجائے تو اٹھو اور اسلام کے دشمنوں سے جنگ لڑو۔

تو جو آدمی کپڑے، اور کھانے پینے، اور دنیاوی تکلفات و تعیشات میں زندگی صرف کردے۔ وہ تو صرف گھوڑا پالنا ہوا اور مقصد کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ تو اسلام میں حب النفس۔ یعنی اپنی جان سے محبت رکھنا، یہ بھی خود اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے تاکہ عبادت کیلئے بدن کی پرورش ہوتی رہے۔

نہ پرورش سے غفلت اور نہ عبادت و بندگی سے غفلت رہے۔ بلکہ راہ اعتدال رہے۔ یہ راہ اعتدال اس لئے اختیار کی گئی، کہ مسلمان نہ تو یورپ کی طرح بدن کی پرورش و دیکھ بھال میں لگا رہے اور نہ جوگی کی طرح صرف عبادت میں مصروف رہ کر نفس کشی کرتا رہے۔ تو فرمایا۔ عبادت بھی کرو اور کھاؤ پیؤ بھی سہی - کلوا واشربوا ولا تسرفوا۔ کہ کھاؤ پیؤ اور اسراف نہ کرو۔ کلوا۔ کہ کھاؤ، اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشی کا اظہار فرمایا۔ اگر اللہ تعالیٰ نہ بھی فرماتے تو پھر بھی ہم کھاتے مگر یہ اللہ تعالیٰ کی خوشی ہوگی۔ یاایہاالرسل کلوامن الطیبات واعملوا صالحا۔ اے پیغمبرو (علیہم السلام) حلال کھاؤ اور

کام بھی کرو یعنی نیک اعمال کرو۔

تو اللہ تعالیٰ نے نہ تو افراط فرمایا۔ کہ انسان نفس کی پرورش میں لگ جائے اور نہ ہی تفریط فرمائی کہ انسان صرف عبادت میں لگا رہے۔ بلکہ راہِ اعتدال اختیار کی۔

بزرگوں نے لکھا ہے کہ روزہ مسلمانوں کا امتحان ہے۔ احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون۔ کیا لوگوں کا یہ گمان ہے کہ انہیں ان کے ایمان کے دعویٰ پر چھوڑ دیں گے۔ اور ان کا امتحان نہ لیا جائے گا۔ ہم نے تم سے پہلی امتوں کا امتحان لیا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سچا ایمان آجائے۔ جب رمضان کی پہلی شب آجائے تو سمجھو کہ امتحان آگیا۔ اگر روزانہ امتحان ہوتا تو پھر کیا کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف سالانہ امتحان رکھا۔

یہ حب النفس کا امتحان ہے۔ ہمارے نفس کو چار چیزیں زیادہ محبوب ہیں۔ 1۔ کھانا۔ 2۔ پینا۔ 3۔ نیند۔ 4۔ بیوی کی صحبت۔ اور یہ چاروں چیزیں روزہ کی حالت میں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ امتحان اس لیے ہے کہ دیکھا جائے کہ یہ چار چیزیں پیاری ہیں کہ یا اللہ تعالیٰ پیارے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ پیارا ہے تو اسکا کہنا مانو۔ اور پھر یہ مہربانی کی کہ سحری ہمارے اختیار پر نہ چھوڑی۔ کہ سحری کھاؤ یا نہ کھاؤ۔ بلکہ شرعی حکم لگایا۔ تسحروا فان فی السحور برکت حدیث ہے ، کہ سحری کھاؤ اس میں برکت ہے۔ سحری کھانا مسنون ہے۔ تو اللہ

تعالیٰ کو حب النفس میں اعتدال مقصود ہے۔ نہیٰ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن صوم الوصال۔ کہ روزہ میں وصال نہ کیا کرو۔ یعنی دو دو یا تین تین دِن کا روزہ نہ رکھا کرو۔ مثلاً بدھ کو رروزہ رکھا اور جمعہ کو افطار کیا یہ گناہ ہے۔

حضور پاک صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے وصال جائز ہے۔ تو صحابہ کرامؓ نے عرض کی۔ انک تواصل۔ آپ تو وصال فرماتے ہیں۔ تو فرمایا انی لستُ کمثلکم، کہ میں تم جیسا نہیں ہوں۔ میں رات کو عبادت کرتا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھ میں روحانی طور پر طاقت ڈال دیتا ہے۔ اس لئے یہ معاملہ میرے ساتھ ہے تمہارے ساتھ نہیں۔

علماء کا اتفاق ہے کہ افطار میں تعجیل مستحب ہے۔

بشرطیکہ وقت ہو چکا ہو۔ سورج غروب ہو چکا ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے افطار کرنا چاہا۔ ایک صحابیؓ کو فرمایا اسے کسی برتن میں پانی ڈال کر گھول دے تو صحابیؓ نے کہا کہ ابھی تو دن کھڑا ہے۔ تو فرمایا جب مغرب سے سورج ڈوب جائے اور مشرق سے اندھیرا ہو جائے تو تمہارا روزہ کھل گیا چاہے تم کھاؤ یا نہ کھاؤ۔ مطلب یہ کہ روزہ اول وقت میں کھولو۔

توسحری و افطاری کی پابندی اور عید کے روزے کی ممانعت - یہ گویا حب النفس کیلئے اعتدال پیدا کرنا ہے۔ روزہ حقیقت میں اصلاح نفس و اعتدال نفس کیلئے مشق ہے۔

ہر کام کیلئے ایک باعث اور ایک رکاوٹ ہوتی ہے۔ مثلاً ایک پرندہ کے پاؤں باندھ دیے جائیں تو یہ اس کی پرواز سے رکاوٹ ہے۔ لیکن اگر اسکے پاؤں کھولے جائیں۔ اور اسکے پر نہ ہوں تو بھی نہ اڑ سکے گا۔ تو اس پرواز کی طرح روحانی پر ہیں۔ کہ مومن کی روح کو اللہ تعالیٰ کی طرف اُڑ جانا چاہیئے۔ تو اللہ تعالیٰ تک رسائی کیلئے ضروری ہے کہ مومن اڑان اور پرواز کرے۔ اور پرواز کے لیے جو رکاوٹیں ہیں انھیں ہٹایا جائے۔ یہ رکاوٹیں وہی چار چیزیں ہیں جنہیں پہلے ذکر کر آیا ہوں۔ کھانا۔ پینا۔ نیند۔ ہمبستری۔

تو جو روزہ دار ہے وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ تک رسائی کی رکاوٹ کو دور کرتا ہے۔ تو رسی جو پرندے کے پاؤں میں بندھی ہوئی تھی۔ اسے تو روزہ نے کھول دی۔ اب اللہ تعالیٰ نے روحانی پرواز کیلئے قرآن بحیثیت پر دیدیا۔ جو اوپر سے آیا ہے اور اوپر لیجانے والا ہے اب اس سے جوڑ قائم کرو۔ رسی تو روزہ نے کھول دی پرندہ دو پروں سے اڑتا ہے۔ ایک پر روزہ ہے اور دوسرا پر قرآن ہے۔

قرآن اترا بھی رمضان شریف میں ہے۔ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے تو لکھا ہے کہ ہر آسمانی کتاب، صحیفے، رمضان شریف میں اترے ہیں اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ تمام امتوں پر روزے فرض تھے۔ یعنی دیگر مہینوں کے فرض تھے اور رمضان کے بھی فرض

تھے۔ ایک مرتبہ عیسائیوں کے بادشاہ کو مرض لاحق ہوا۔ تو کہا کہ اگر شفاء ہو گئی تو ہم تیس کے چالیس کر دیں گے۔ اسی طرح ان میں ایک مرتبہ وباء پھیل گئی۔ تو پھر کہا کہ اگر وباء ہٹ گئی تو ہم پچاس کر دیں گے۔

آج پرویز خبیث، اور قادیانی، دین میں تحریف کرنے والے شیطان کا دین بنا رہے ہیں۔ جن خبیثوں نے خدا کو تین کہا وہ دین کو کیوں نہ کاٹیں گے۔ تو بہرحال منافقوں کے آگے ایک ظلمت تھی کہ ظاہراً اسلام ہے۔ مگر اندر سے نہیں۔ ہم بھی آجکل اسی طرح کر رہے ہیں کہ مردم شماری آئی تو اسلام کے خانہ میں اسلام لکھوا دیا۔ مگر دراصل ہوتے نہیں۔ تو ان کے قلب پر ظلمت آگئی۔ اسلئے اسلام پر عمل کرنے سے رک گئے۔ کہ نہ روزہ رکھا، نہ جہاد کیا، نہ کھانا پینا ترک کیا۔ تو حب النفس کی تاریکی تھی۔

-2- حب المال۔ کہ مال کی محبت۔ اسلام کے دائرے میں آنے کے بعد مال بھی قربان کرنا پڑتا ہے۔

این امانت چند روزہ نزد ماست

تو اسلام قبول کرنے کے بعد۔ عشر و زکوۃ۔ جانور۔ نقد رقم۔ اور زمین میں سے زکوۃ دینی پڑے گی۔ یہ چیز ان کے لیے رکاوٹ بنی۔

-3- حب الجاہ۔ یعنی شہرت کی محبت۔ کبھی انسان نام نہاد عزت

کو بڑی چیز سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے لیے وہ حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ عبداللہ بن ابی منافق سردار بنایا جا رہا تھا۔ تاج وغیرہ بن چکا تھا۔ کہ اتنے میں حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے تشریف لے آئے۔ تو لوگ آپ سے بیعت کرنے لگے۔ اس کے سارے ارادے خاک میں دفن ہو گئے۔ اب عبداللہ بن ابی نے سوچا کہ اگر میں ظاہری طور پر مسلمان نہ ہوا تو مدینہ میں رہنا مشکل ہو جائیگا۔ اور یہ عزت کے خلاف ہے اور اگر مرید بنوں، آپ کے ہاتھ پر بیعت کروں تو مسلمان بننا پڑے گا۔

بدا الاسلام غریباً۔ کہ اسلام غریبوں میں شروع ہو گا۔ غریب کا معنی یہ کہ وہ مسافر جس کا کوئی واقف نہو۔ وسیعود غریباً فطوبیٰ الغرباء۔ کہ ان لوگوں کے لیے خوشی ہے کہ اسلام غریب ہو۔ اور وہ غریب لوگ اس سے چمٹ جائیں۔ رعد۔ گرج کو کہتے ہیں۔ رعد معنی خوف۔ کہ جس طرح آسمانی بارش کے اندر گرج ہے تو اسی طرح وحی الہیٰ کی بارش بھی منافقوں کو گرج معلوم ہوئی اور وہ اس سے ڈر گئے۔ خوفزدہ ہو گئے۔

ایک تو اسلام کے وہ احکام جن میں جان کی قربانی ہے۔ مثلاً جہاد۔ کہ اس میں جان پر کھیلنا پڑتا ہے۔ تو اس خوف نے انہیں اسلام سے روکا۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ رعد۔ منافقوں کے لیے ایک اور بھی رعد تھا۔ وہ یہ کہ منافقوں کو یہ خوف تھا۔ کہ بذریعہ

وحی حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بتلایا جائے کہ فلاں فلاں منافق ہیں۔ مسلمان نہیں۔ تو اس لیے یہ ان کے لیے رعد ہے۔ شانِ رب العلمینی تو دیکھو کہ جب تک قیامت نہ آئے پردہ رکھتا ہے۔ قرآن میں منافقوں کا اکثر جگہ ذکر ہے۔ مگر اللہ تعالے نے ذکر عام کیا ہے۔ کسی کا نام لے کر تخصیص نہیں کی۔ اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ مولویوں کو کس طرح تبلیغ کرنی چاہیے۔ جب علماء منہیات و ماموراۃ کی تبلیغ کریں تو شخصی تعین نہو تعمیم ہو۔ شخصی تعین سے ضد بڑھکر تبلیغ بے اثر بن جاتی ہے۔ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ رنگون میں تقریر کرنے گئے۔ وہاں کے لوگوں نے کہا کہ حضرت آج اپنی تقریر میں بدعتیوں کو خوب رگڑنا۔ تو حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے تو کسی کی خبر نہیں لینی۔ بس جو کچھ حق ہے اسے بیان کر دوں گا۔ مگر آج تو سٹیج پر آئے اور دوسرے کو گالی دینا شروع کر دی۔ تو رعد کے متعلق مفسرین نے لکھا ہے کہ منافقین کو ڈر تھا کہ کہیں ہمارا پردہ فاش نہو جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قیامت تک پردہ رکھا۔

برق بجلی کو کہتے ہیں۔ بارش میں بھی بجلی ہوتی ہے۔ جب یہ چمکتی ہے تو راہ کھل جاتی ہے۔ تو وحی الہیٰ کی بارش میں کبھی قرآنی دلیل ایسی آجاتی تھی کہ منافقین کے دل کو روشنی معلوم ہوتی تھی۔ تو پھر کہتے کہ یہ درست ہے۔ قرآن۔ کلما اضاء لہم مشوافیہ۔ کہ جب

چمک آجاتی تو چلتے تھے۔ اور جب محبت دنیا و خود غرضی آجاتی تو رک جاتے تھے۔

اور یا برق سے مالی مفاد مراد ہے۔ کہ جب دیکھتے تھے کہ جہاد میں مسلمانوں کو کتنا زیادہ مال غنیمت ملا ہے۔ کہ مسلمان امیر بن جائیں گے۔ تو اس جی چاہنے یا اس خواہش کو برق کہا گیا ہے۔ مگر خود غرضی یہ آجاتی کہ اگر ہم جہاد میں مر گئے تو پھر کیا ہو۔ یہ رکاوٹ تھی۔

یجعلون اصابعھم فی اذانھم من الصواعق۔ یہ لوگ کان میں انگلی ڈال کر بند کر لیتے تھے تاکہ قرآن نہ سنیں۔ اگر واقعی یہ کان میں انگلی ڈال لیتے تھے تو یہ درست ہے۔ ورنہ یہ ہے کہ قرآن نہ سنتے تھے اور نہ اس پر عمل کرتے تھے۔ تو گویا کان میں انگلی ڈالے ہوئے بن گئے۔

ان چار چیزوں کی شرعی اور فلسفی تحقیق دوسرے درس میں بیان ہو گی۔ لیکن صواعقہ کی مثال ایسی دی کہ۔ شیخ بو علی سینا نے لکھا ہے کہ اشرفیوں کا ایک تھیلا تھا۔ آسمان سے ایک کڑک پڑی کہ اشرفیاں خاک بن گئیں۔ مگر ریشم کا تھیلا محفوظ پڑا ہے۔

تو کڑک سخت چیز پر اثر انداز ہوتی ہے۔ نرم پر نہیں ہوتی۔ تو اس سے ایک نکتہ یہ پیدا ہوا کہ موت ایک کڑک ہے۔ دل جب سخت ہو جاتا ہے تو خوف ہوتا ہے۔ اور جب دل نرم ہوتا ہے تو خوف نہیں ہوتا۔

درس نمبر۲۹
25دسمبر1966ء

مَقصدِ تمثیل

منافقوں کی دوسری مثال بارش والی جو تھی اس کی کچھ تحقیق تو گزری۔اب یہاں دو چیزیں قابل غور ہیں۔1۔مقصد تمثیل۔کہ اس مثال سے اللہ تعالی کیا سمجھانا چاہتا ہے۔

تو مقصد یہ ہے کہ وحی الہی اور قرآن کو بارش سمجھو۔ اور بارش کے ساتھ چند ملی جلی چیزیں ہوتی ہیں۔ مثلاً۔ تاریکیاں۔ گرج۔ اور چمک۔ ایک تو بجلی کی چمک ہوئی اور دوسری کڑک ہوئی۔

تو یقینی بات ہے کہ یہ چیزیں بظاہر تو تکلیف دہ ہیں۔ تاریکیاں مشقت اور مصیبت کا سبب ہیں۔ گرج سے بھی خوف پیدا ہوتا ہے۔ اور کڑک تو خود تباہ کن چیز ہے۔اور برق کی چمک تھوڑی دیر کیلئے ہو تو وہ خوش کن ہوتی ہے۔مگر روشنی بجھنے کے بعد بہت پریشانی ہوتی ہے۔ اس مثال سے مدینہ منورہ میں قرآن اور وحی الہی کی بارش ہوئی۔مومنین نے تو بارش کو لیا اور منافقوں نے گزشتہ چار چیزیں لیں۔تاریکی۔ گرج۔ چمک۔ کڑک۔ تو

چونکہ یہ چار چیزیں بارش سے ملحق ہوتی ہیں۔ تو مسلمان کو ان کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ آپ دیکھیں کہ بارش کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ 1۔ یہ کہ بارش سے آبادی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ زمیندار بہت فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور گرج وغیرہ تو چند منٹ کی تھی مگر بارش کا فائدہ کافی عرصہ کیلیے ہوتا ہے۔ تو تکلیف تھوڑی اور فائدہ زیادہ۔ تو اللہ تعالیٰ یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اگر دین کے کاموں میں کچھ تکلیف ہو تو اسے بارش کی طرح تصور کرو۔ لوگ اسی لیے تو ان چیزوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور اسے باران رحمت کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور روحانی بارش قرآن اور وحی الٰہی کی نازل ہوئی۔ یہ ذات معلیٰ کی طرف سے ہے۔ اس لیے اس کے فوائد لامحدود ہیں۔ مگر کچھ نہ کچھ تکلیف تو ہو گی۔ مثلاً سردیوں میں وضو کی تکلیف وغیرہ وغیرہ۔ تو ایسی تکلیف کو برداشت کر لو کیونکہ اسکے فوائد بہت ہیں۔ انسان کی کون سی چیز ہے جس میں تکلیف نہ ہو۔ سب سے زیادہ روٹی انسان کو محبوب ہے۔ اس کیلئے کتنی مصیبت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ کہ زمین تیار کی۔ پھر تخم ڈالا۔ پھر پانی دئے۔ پھر کٹائی۔ پھر روندا۔ پھر پسوانا۔ پھر گوندھنا۔ پھر پکانا وغیرہ۔ یہ کتنی لمبی عرصہ کی تکالیف ہیں۔ مگر روٹی کا مزا صرف ایک منٹ کا۔ تو تکلیف سے سکھ ہے۔ عارف رحمتہ اللہ علیہ:۔ کے شعر کا معنی ہے۔ کہ اے اللہ تو نے روح کے بازار میں آخرت کی فکر رکھی ہے۔ اور تو

نے ہر فائدہ کے موتی کو تکلیف کی جیب میں رکھا ہے۔ اسلام کی پوری تعلیم یہ ہے۔ کہ عیاش کے لیے نہ دنیا ہے نہ آخرت اور طوفانوں سے کھیلنے والا اور تکلیف برداشت کرنے والا دنیا بھی لے لیتا ہے اور آخرت بھی پالیتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر کام کیلئے کچھ تکلیف رکھی ہے۔ تاکہ عیش و عشرت پیدا نہ ہو۔ بلکہ تکلیف کا مادہ پیدا ہو۔ یہ روزہ وغیرہ میں اللہ تعالی کو کیا فائدہ ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ہمیں مجاہد بنانا چاہتا ہے۔ مگر ہم تو پوڈر وغیرہ لگا کر پری بننا چاہتا ہے۔ حج۔ حج کی تکلیفات کے ویسے تو ہزاروں فلسفے ہیں۔ مگر بڑا فلسفہ یہ ہے کہ مسلمان گھر کا ینڈک نہ بنا رہے بلکہ باہر نکل کر اللہ کی عبادت کے ساتھ خوگر بھی ہو جائے۔ اور مشقت و مصیبت کا عادی بھی بن جائے۔ نماز۔ نماز کی پانچ وقت کی پابندی بھی اپنے اندر ہزاروں حکمتیں لئے ہوئے ہے۔ اور ایک یہ بھی کہ وقت کی پابندی کے علاوہ، مجاہد، سپاہی و چست بن جائے۔ آج تو گورنروں کو بکواسیں آرڈر دی جاتی ہیں۔ مگر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے گورنروں کو ایک خط آرڈر کی صورت میں لکھا۔ کہ تم لوگوں سے نماز کی پابندی کراؤ۔ اسلامی سلطنت کا یہ ایک مقصد ہے۔ فمن حفظها فهواحفظ لما سواها۔ فمن ضاعها فهواضيع لما سواها۔ جو نماز پر پابندی سے عمل کرائے گا۔ وہ دوسرے احکام کی زیادہ حفاظت و پابندی کرے گا جو اس کو ضائع کرے گا وہ اس کی سوا

زیادہ ضائع کریگا۔ آپنے یہ دیکھا کہ مرد کیلئے سونا کیوں حرام کیا۔ تاکہ تمہیں نمازی بنائیں۔ تم سے نسوانیت دور رہے بہر حال اسلام پورا کا پورا جفا کشی کا نام ہے۔ بارش تھوڑی دیر برسی، کیچڑ، گرج وغیرہ کی چند منٹ کی تکلیف برداشت کی۔ مگر غلہ واناج کی صورت میں فوائد بہت ہوئے۔ اسی طرح قرآن کی بارش کہ اس پر عمل کرنے سے تھوڑی مشقت تو ہوگی۔ مگر آگے چل کر بہت فائدے ہوں گے۔ طبقات الاولیاء میں ہے کہ ایک بزرگ محنت سے تھک گئے۔ تو نفس کو کہنے لگے کہ اے نفس، عبادت وحرکت بازو ہلانے کا نام ہے۔ چند منٹ عبادت کر کے حرکت کر لو۔ پھر قبر میں ہزاروں سال ٹانگ پھیلا کر آرام کرنا ہے۔ بس پھر تھکاوٹ دور ہو جائیگی۔

حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ آرام چاہیئے تھا۔ مگر آپ کو خطاب ہے۔ فاذا فرغت فانصب والی ربک فارغب، جب آپ دین ودنیا کی باتوں سے فارغ ہو جائیں، تو پھر اپنے آپ کو عبادت میں تھکا دو۔ حضرت بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ رات کو اتنی کثرت سے عبادت کرتے تھے۔ کہ آپ کے پاؤں مبارک کا چمڑہ پھٹ گیا۔ میں نے عرض کی آپ تو بخشے ہوئے ہیں۔ آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں۔ فرمایا افلاکون عبداً شکوراً کیا میں شکر گزار نہ بنوں۔

امام منذری رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جس

آدمی نے دنیا میں دین کے کاموں کیلئے بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ پھر جب اسے آخرت میں جنت کی نعمت ملے گی۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیگا۔اے بندے اب تجھے وہ دنیاوی تکلیفیں یاد آتی ہیں۔ تو وہ کہیگا، کہ اگر آپ مجھے دنیا میں بھیجتے اور وہاں چکی میں پیستے اور مجھے کہتے کہ تجھے اس کے بدلے میں جنت ملے گی تو ایسی دنیاوی زندگی بہت بہتر تھی۔

حضرت سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ ایک مرتبہ ڈھابیل میں تشریف لائے۔ چائے پی کر اٹھنے لگے تو دل کا دورہ پڑ گیا۔ دو گھنٹے رکوع کی حالت میں کھڑے رہے۔ میں نے طبع پرسی کا خط لکھا۔ چونکہ آپ ادیب بھی تھے ایک مصرعہ لکھا اور کہا کہ دوسرا مصرعہ خود لکھدیں۔ برسر اولاد آدم ہر چہ آید بگذرد۔ کہ اولاد آدم پر جو تکلیف آتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے لکھا (راحت دنیا بود یا زحمت ناپائیدار) کہ دنیا کی رحمت یا زحمت ہو دونوں گزر جانے والی ہیں صرف آخرت کی راحت اور زحمت ہی پائیدار ہے۔ تو راحت کی ایک چیز بارش ہے۔ باقی ظلمت، رعد، کڑک، یہ زحمت ہیں۔

قرآن نے تو عبرت کا پہلو لے لیا۔ اب فلسفہ کی ضرورت ہے۔ قرآن نے فرمایا۔ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ۔ سما کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ کہ زور دار بارش جو آسمان سے نازل ہو۔ بہت

لوگوں کو شبہ پیدا ہوگا کہ بارش تو بادل سے ہوتی ہے نہ کہ آسمان سے۔ تو بارش برسانے والا زیادہ جانتا ہے یا دو ٹانگوں والا پروفیسر۔ عربی میں سماء کا لفظ آسمان اور بلند چیزوں پر بولا جاتا ہے۔ ابو منصور ثعلبی کی فقہ اللغات۔ کہ جو چیز اونچی ہو وہ سماء ہے۔ خود قرآن بھی کہہ رہا ہے۔ فلیمدد بسبب الی السماء ثم لیقطع۔ کہ جس کا دل اس لئے جلتا ہے کہ مسلمان کو امداد کیوں ملتی ہے۔ تو وہ چھت سے رسی باندھ کر خود کشی کر لے۔ پھر بھی یہ امداد نہ ٹلے گی۔ تو او کصیب من السماء کا معنی یہ ہے کہ اوپر سے بارش ہوتی ہے چاہے آسمان سے یا بادل سے۔ فتثیر سحابا فسقناہ الی بلد میت۔ ان بدبختوں کو یہ پتہ نہ چلا کہ خود قرآن نے بھی بادل کا لفظ بیان کیا ہے۔ دوسری آیت فتری الودق یخرج من خلالہ۔ کہ تو بارش کو دیکھے گا کہ وہ نکلتی ہے بادل کے اندر سے۔ تو بادل کا لفظ تو خود قرآن نے بھی لیا۔ سائنس والوں کی نظر ناقص تھی۔ صرف ایک پہلو لیا۔ ہوا میں بادلوں کو پھر تو ہم ویران علامہ ثعلبی کہتے ہیں یعنی صرف بادل کو لیا۔ مگر اللہ تعالے نے آسمان و بادل دونوں کو لیا۔ خود سائنس والے کہتے ہیں کہ سورج کے گرم ذرے پانی پر پڑتے ہیں اور بادل بن کر بارش ہوتی ہے۔ اگر عالم بالا کا نظام نہوتا تو بارش نہ ہوتی۔ یہ بادل خود بخود تو نہیں بن جاتا۔ فلاسفر بھی حیران ہیں کہ یہ کیسے بنتے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی ایک عظیم الشان

جہان ہے۔ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ کہ بادل اگر ہلکا ہو تو اسے اوپر چڑھنا چاہیے۔ اور اگر وزنی ہو تو اسے نیچے آنا چاہیے۔ لیکن یہ کسی خاص ہستی جو اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔ اپنے اسے زمین و آسمان کے درمیان لٹکا رکھا ہے۔ پھر سطح کو برابر کرنا۔ اگر کہیں صدر مملکت نے آنا ہو تو وہ صرف ایک گراؤنڈ کو کتنی مشکل سے ہموار کرتا ہے۔

مگر یہ بادل شروع میں چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ اور پھر آنکھ جھپکنے کی دیر میں سطح بن جاتی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری کارروائی ملکی نظام سے ہوتی ہے۔ اور ملائکہ بھی عالم بالا کی چیز ہیں۔ تو ایک تو سورج کی شعائیں بادل بنانے میں کام آتی ہیں۔ جو عالم بالا کی چیز ہے دوسرا ملائکہ کا تعلق بھی آسمان سے ہے۔ تو ان وجہوں سے سماء کا لفظ درست بیان ہوا۔

جو چیزیں آسمان پر ہیں انہیں سماوی اور جو زمین پر ہیں، انہیں ارضی۔ اور جو درمیان میں ہیں، انہیں جوی کہتے ہیں۔ باقی رہی ظلمت اس کی تحقیق کی تو کوئی ضرورت نہیں۔

باقی رہی برق و گرج۔ فلاسفر یہ تحقیق بھی حل نہ کر سکے۔ کہتے ہیں کہ نیچے سے بخارات جب اوپر جاتے ہیں تو بادل رکاوٹ بنتا ہے۔ تو بعضوں پر آگ لگتی ہے سلسے بجلی کہتے ہیں۔ اور بعضوں پر رگڑ ہوتی ہے تو گرج بن جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ پہلے تو

یہ سائنس کی بنیادی غلطی ہے۔ کہ سورج کے شعلوں سے جو بخارات بنے اور اوپر جا کر بادل سے ٹکرائے۔ پھر کوئی بجلی بنی اور کوئی گرج بنی۔ سوال یہ ہے کہ خود بادل بھی تو سورج سے بنتا ہے۔ تو یہ دونوں چیزیں ایک ہی وقت میں بنیں۔ اور ایک ہی وقت میں چلیں ۔ تو یہ تو اس طرح ہو گیا کہ دو بیل ایک گاڑی میں ایک ہی وقت میں جوتے گئے۔ اور ایک ہی وقت میں چلے تو یہ کس طرح رکاوٹ پیدا کریں گے یعنی ایک دوسرے کے چلنے میں کیسے رکاوٹ پیدا کریں گے۔ دوسری چیز یہ کہ سائنس نے ان کے ملنے کی آواز اور ٹکر جو بیان کی ہے۔ تو یہ صورت تو سخت چیزوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے ۔ نہ کہ نرم چیزوں کے ٹکراؤ سے۔ کیا سمندروں اور دریاؤں میں بڑی وزنی مچھلیاں پانی کو پھاڑ کر چلتی ہیں۔ کبھی ان کے ٹکراؤ کی آواز سنی ہے۔ پانی سے تو بادل بہت نرم ہیں۔ تو وہاں کس طرح آواز پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لیے قدیم و جدید فلاسفروں نے اقرار کیا کہ کوئی ظاہری توجیہ نہیں بنا سکتے۔ بس عقلی توجیہ کی۔ بس تو گویا اقرار کر گئے کہ ہم اسے حرف آخر نہیں بنا سکتے۔ تو میں کہتا ہوں کہ تمہاری سائنس روشنی کا مسئلہ حل نہیں کر سکی۔ کہ سورج نکلا تو روشنی ہو گئی۔ اسی طرح بجلی چمکی روشنی ہو گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان میں کچھ نہیں۔ بس اللہ تعالے کی بات زور دار ہے۔ اللہ نور السموٰت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

فلاسفروں نے لکھا کہ روشنی اس وقت آتی ہے کہ جب سورج کے باریک ذرے نیچے اتر کر آئیں تو روشنی ہو گئی۔ میں کہتا ہوں کہ ان کے اصول کے مطابق کمرے میں روشنی ہے تو ذرے بھی ہیں۔ اور جب دروازہ بند کر دیا جاتا ہے تو پھر وہ ذرے کہاں جاتے ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ سائنس والوں کی یہ توجیہ غلط ہوئی۔ دوسری توجیہ پر مان گئے۔ کہ روشنی سے انسان چیزوں کو دیکھتا ہے۔ مگر یہ پتہ نہیں کہ روشنی کیا چیز ہے۔

درمنثور میں ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے بادلوں کے نظام میں فرشتے مقرر کر رکھے ہیں۔ تو اس سلسلے میں فرشتوں کو آلات کی ضرورت ہے۔ مثلاً ایک کوچوان اگر بگھی چلائے تو گھوڑے کو کسی کسی وقت میں لکڑی مارتا ہے۔ اور کبھی کبھی گھوڑے کو آواز دیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایک چابک دیا ہے جب مارتے ہیں تو اس سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اور جب آواز دیتے ہیں تو گرج پیدا ہوتی ہے اور جب چابک سے بجلی کا ٹکڑا ٹوٹ گیا تو گر پڑتی ہے۔ تو آپ دیکھیں کہ گرج کی آواز۔ دنیا کی کسی آواز سے نہیں ملتی۔ ملکی نظام بہت مضبوط نظام ہے۔ یہ مضبوطی کی دلیل نہیں کہ پوری دنیا نفخہ اسرافیل علیہ السلام سے ختم ہو جائے گی۔ آج کی نئی تعلیم سے ایک نیا مرض بھی پیدا ہوا ہے کہ بعض کو انگریزی تعلیم سے اتنا اثر پڑا کہ کہتے ہیں کہ سرے سے آسمان بھی نہیں ہے۔

ایک شخص نے کہا آسمان نہیں۔ جب اسے اوپر کی جانب دکھا کر کہا گیا کہ اوپر کیا ہے۔ تو کہا صاحب یہ حد بصر ہے۔ یعنی نگاہ کی آخری سرحد ہے۔ آسمان تو نہیں ہے۔ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہم تو آسمان کو آپکی نظر کی سرحد سے کافی دور مانتے ہیں۔ تسلیم کرتے ہیں۔ جہاں ہم مانتے ہیں وہاں آپکی نظر نہیں جا سکتی اور جہاں آپکی نظر ہے وہاں ہم نہیں مانتے۔ تو اگر آدمی یہ اعتراض کرے کہ ہم لاہور سے کراچی گئے۔ کوئی مچھلی نہیں دیکھی۔ یہ اعتراض غلط ہے۔ آپکی نظر تنگ ہے کہ خشکی پر مچھلی کہاں سے آئی۔ یہ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ میرے نزدیک تو یہ ہے کہ مثلاً عینک کے شیشے وغیرہ جو ہیں وہ خالص سفید ہیں۔ اگر سبز شیشہ ہو تو سبز رنگ چڑھ جاتا ہے۔ تو ہو سکتا ہے آسمان سفید ہو اور جو بخارات زمین سے آسمان کی طرف چڑھتے ہیں۔ ان سے مل کر رنگ بدل جاتا ہے۔

درسِ نمبر۳
30دسمبر1966ء

مثال کا بنیادی اصول

آج کے درس میں منافقوں کی مثال کا خلاصہ بیان کرنے کے بعد۔ اس مثال سے جو بنیادی مقصد ہے۔ اس پر کلام ہوگی۔ پہلی چیز جو مثال اول کے بعد ذکر ہے۔ صم بکم عمی فھم لایرجعون۔

ان تین صفات کا تذکرہ منافقوں کے بارے میں کیا گیا اور اس کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ یہ ایمان نہ لائیں گے۔ ہدایت کے تین دروازے ہیں ۔1۔ کان جس سے آدمی پیغمبر علیہ السلام اور عالم کا وعظ سنتا ہے۔ یہ کان کا بنیادی مقصد ہے۔ ضمنی مقصد اور بھی ہیں۔ بکم گویا ابکم کی جمع ہے۔ گونگا وہ ہوتا ہے جس کے پاس قوتِ گویائی نہ ہو۔ جانوروں کیلئے قرآن کی تلاوت ضروری نہیں تو سامان بھی نہیں دیا۔ یعنی قوت گویائی۔ مگر آدمیوں کو قوتِ گویائی دی اور ساتھ ہی حکم دیا کہ قرآن پڑھاؤ بھی سہی اور پڑھو بھی۔

آج بڑے بڑے عالم قرآن نہیں پڑھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم تو

معقولات وغیرہ کی بڑی بڑی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ کیا خدا کے قرآن سے اوپر بھی کوئی کتاب ہے۔ حضرت معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ وظائف کم پڑھتے تھے۔ اور لاہور کے بچوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔ یہی چیز حضرت بختیار کاکی رحمت اللہ علیہ نے کی کہ ساری عمر قرآن پڑھایا۔ آپ حضرت بابا شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ کے پیر ہیں۔ شاہجہان رحمتہ اللہ علیہ کو اورنگ زیب رحمتہ اللہ علیہ نے جیل خانہ میں بند کیا ہوا تھا۔ عرض کی یہ تو سیاسی وجہ سے قید دی گئی ہے۔ آپ اگر کوئی حکم فرمادیں۔ تو پورا کریں گے۔ تو شاہجہان نے کہا کہ محلہ کے چند بچے بھیج دو انہیں قرآن پڑھا دیا کرونگا۔ عبدالملک رحمتہ اللہ علیہ کی طرف سے حجاج رحمتہ اللہ علیہ گورنر تھا۔ جو ظالم کے نام سے مشہور ہے۔ یہ صبح کے وقت کچھ دیر محلہ کے بچوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔ اور پھر لطف یہ کہ پیدل چل کر جاتے تھے۔

حدیث۔ اشد الناس عذاباً یوم القیمتہ عالم لم ینفعہ علمہ، سب سے زیادہ عذاب قیامت میں اس کو کہ وہ عالم جس کے علم نے اسے نفع نہ دیا ہو۔ مطلب یہ کہ جتنا علم تم جانتے ہو اسے دوسرں کو سکھاؤ۔ تو قوت گویائی قرآن پڑھنے کیلئے ہے اور پڑھانے کے لیئے ہے۔ اور خود حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھایا ہے۔ یتلوا علیہم اٰیتہ۔ کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام

امت کو قرآن پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ جو اس سے محروم ہے تو اسکی بدبختی آخری درجہ میں ہے۔ جس کی اصلاح نہیں۔ عمی۔ یہ تیسری چیز ہے کہ وہ اندھے ہیں۔ اگر اس آنکھ سے سب کچھ دیکھا۔ مگر بنیادی مقصد نہ دیکھا تو وہ اندھے ہیں۔

تو اللہ تعالی کا جملہ بڑا زور رکھتا ہے۔ کہ منافق باوجود سننے کے بہرے ہیں اور باوجود بولنے کے گونگے ہیں۔ اور باوجود دیکھنے کے اندھے ہیں۔ کیونکہ جس مقصد کیلئے یہ نعمتیں دی گئی ہیں۔ ان میں تو انہیں استعمال ھی نہیں کیا۔ تو یہ تو جوتے والی مثال ہو گئی کہ بغل میں دبائے پھرتا ہے کہ کہیں بچھو وغیرہ مل گیا تو اسے ماروں گا اور بنیادی مقصد پاؤں میں اسے استعمال نہیں کرتا۔ تو یہ جوتا، جوتا نہ ہونے کے برابر ہے۔

یہاں تو اللہ تعالی نے حقیقت حال بتلائی۔ لیکن آخرت میں یعنی قیامت میں یہ چیز حقیقت بن کر آئیگی۔ آخرت میں اللہ تعالی ان قوتوں کو سلب کر لے گا

ونحشرھم یوم القیمۃ علی وجوھم۔ قیامت میں ایسے لوگوں کو منہ کے بل چلائیں گے، معلوم ہو گیا کہ یہ دنیا میں اُلٹے چلتے تھے۔ کہ باطل کو اوپر اور حق کو نیچے رکھا۔ تو آج قیامت میں ہم بھی انہیں اُلٹا چلائیں گے۔ اور اندھے گونگے اور بہرے ہوں گے۔

اس آیت کے پڑھنے پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا سر کے بل کس طرح چلیں گے۔ فرمایا جو خدا پاؤں کے بل چلا سکتا ہے وہ سر کے بل بھی چلا سکتا ہے۔

عمیاو بکماو صما۔ اور واقعی اندھے، بہرے، اور گونگے ہوں گے۔ اور ایسے ہوں گے کہ اربوں سال اسی حالت میں رہیں گے۔ یعنی ابدالاباد اسی طرح رہیں گے۔ ایک جزیہ ہوا، زیادہ تفسیر کی ضرورت نہیں مختصر کرتا ہوں، اس کے بعد انشاللہ 20 جنوری کو درس ہو گا۔

1۔ تو بارش۔2۔ رعد۔3۔ صاعقہ۔4۔ برق۔ ان چار کے متعلق جدید وقدیم فلسفہ نے کچھ تحقیق کی ہے۔ وہ تو کچھ بیان کی تھی۔ اب ایک بنیادی چیز بیان کرتا ہوں۔ تاکہ ہمیشہ کے لیے شریعت اور فلسفہ کی ٹکر سے محفوظ ہو جائیں۔

فلاسفروں نے ان چار کے جو اسباب بیان کیے ہیں۔ میں نے کہا قرآن ان کا انکار نہیں کرتا۔ مگر قرآن فیصلہ اللہ پر کرتا ہے۔ فلسفہ نے کہا کہ زمین پر سورج کی شعائیں پڑتی ہیں تو اس سے بادل وغیرہ بنتے ہیں۔ یہ بیان پہلے درسوں میں گزرا ہے۔ اس میں فلاسفروں کا یہ قول ہے۔ کہ ہم نے یہ ایک تخمین اور اٹکل قائم کیا ہے۔ یہ کوئی آخری بات نہیں مگر اسلام اللہ تعالیٰ کے ارادے پر قائم رکھتا ہے۔ دیکھو ایک کام جب طبعی یا مادی طریقہ پر ہو تو اس

مین اختلاف نہیں ہوتا۔ مثلاً پانی کا طبعی طریقہ ہے کہ اونچی جگہ سے پستی کی طرف بہتا ہے۔ آگ کی طبعی کیفیت ہے کہ وہ اوپر کو چڑھتی ہے تو طبعی تقاضاؤں میں یکسانیت ہوتی ہے۔

مگر ہمارا کام طبعی کیفیت کے تحت نہیں۔ بلکہ ارادہ کے تحت ہے جب پستی کا ارادہ کیا تو پستی میں چلے گئے اور جب بلندی کا ارادہ کیا تو اوپر چڑھ گئے۔ اب یہ معلوم ہو جائیگا کہ اگر اس میں یکسانیت ہے تو پھر تو سائنس کو مانیں گے اور اگر یکسانیت نہیں تو پھر کہیں گے کہ یہ کام کسی قہار و جبار کے حکم کے تحت ہے۔ مثلاً دیکھو کہ کبھی بادل اوپر جا رہا ہوتا ہے اور کبھی نیچے آ رہا ہوتا ہے۔ اور کبھی شمال سے جنوب اور کبھی جنوب سے شمال وغیرہ کو پھرتا رہتا ہے۔ اسی طرح کسی میں گرج وچمک ہوتی ہے اور کسی میں نہیں۔ یہ کاروائی دلیل ہے کہ یہ کام طبعی نہیں۔ بلکہ کسی ارادہ کے تحت ہے۔ پھر بارش کو دیکھو کہ کبھی کم اور کبھی زیادہ اور کبھی ہوتی بھی نہیں۔ سوال یہ ہے اگر یہ طبعی چیز ہوتی تو جہاں جتنی بارش ہوتی، وہاں ہر سال اتنی ہی ہوتی، کم وبیش نہ ہوتی، مگر یہاں تو کم وبیشی ہے تو معلوم ہو گیا کہ یہ کاروائی طبعیت کے ماتحت نہیں۔ بلکہ مشیت اور کسی کے ارادہ کے ماتحت ہے۔ سورج میں یکسانیت نہیں۔ اللہ تعالے نے ایسا نظام رکھا۔ کہ انسان یہ سمجھ جائے کہ مالک الملک نظام چلا رہا ہے۔ اگر طبعی تقاضا ہوتا تو سورج روزانہ

ایک ہی وقت پر طلوع و غروب ہوتا۔ مگر یہاں تو ایک دن دوسرے دن سے اور ایک رات دوسری رات سے برابر نہیں۔ کیا یہ دلیل نہیں؟ کہ ایک صاحبِ ارادہ طبعیت کے کنٹرول سے نکال کر اپنے اندازہ کے برابر پیدا کرتا ہے۔ و کل شئ بمقدار۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر چیز کا ایک اندازہ ہے۔

یکاد البرق یخطف ابصارھم۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں اچک لے۔ اگر روشنی غالب ہو جائے تو آنکھ کی مغلوب روشنی کو مٹا دیتی ہے۔ ولو شاء اللہ لذھب۔ اگر اللہ چاہتا کہ انہوں نے ان تین چیزوں سے بنیادی کام نہیں لیا تو یہ تینوں چیزیں سلب کر لیتا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اندھیر نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ تین چیزیں موت تک بخشی ہوئی ہیں۔

ومن الناس من یقول امنا باللہ......ان اللہ علی کل شئ قدیر تک نفاق کا لب لباب یہ کہ منافقوں نے نفسانی اور دنیاوی مقصد کو دین کے مقصد پر فوقیت دی۔ جب ذاتی مقصد دینی مقصد کے اوپر آجائے تو جانو کہ اب انتہا درجے کا نفاق ہو گیا ہے۔

منافقوں نے یہ کھیل کیوں کھیلا؟ کہ وہ اپنی ذات کو اونچا کرنا چاہتے تھے۔ مگر آپ کے آجانے کے بعد مدینہ میں ان کا یہ کھیل ختم ہو گیا۔ تو انہوں نے دنیاوی فوائد حاصل کرنے کیلئے زبانی اسلام قبول کر لیا۔ اسلئے اسلام نے روح اور نفس کو اسلام پر

قربان کرنے کا سبق دیا۔ دیکھو عید ایک خوشی کا دن ہے۔ لیکن اسلام نے عید بھی ایک عجیب طریقہ پر منائی ہے۔ اسلام دین فطرت اور خدائی دین ہے اسکی شان نرالی ہے۔ دنیا کی قوموں نے عید کے چند اصول رکھے ہیں۔ 1۔ مثلاً یہ کہ اگر عمدہ موسم آجائے تو اس دن عید ہو گی۔ ایران میں مجوسی بہار کے موسم کو عید کہتے ہیں۔ یا پھر کسی بڑی شخصیت کی پیدائش کا دن۔ جس طرح عیسائیوں کی عید۔ کہ 25 دسمبر عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا دن ہے۔ اس دن عیسائی عید مناتے ہیں۔ یہ تو ایک انسان کی پیدائش سے عید ہوئی۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے تو نہیں ہوئی۔ یا پھر کسی بڑی فتح کے دن عید مناتے ہی تھے۔ جس دن فرعون غرق ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غلبہ ہوا اس دن یہودی عید مناتے ہیں۔

مگر اسلام نے کہا الیوم اکملت لکم دینکم۔ کہ نہ کسی نبی کی طرف تاکو اور نہ کسی کتاب کی طرف تاکو۔ اگر انکی طرف تاکا تو اللہ تعالیٰ کو جھوٹا بناؤ گے۔ یہ آیت کسی اور دین کیلئے نہیں آئی۔ اب تو جنت و جہنم کا فیصلہ اسی آیت پر ہے۔

گرداس پور، پرویز اور محمد علی باپ کی طرف مت تاکو۔ یہ تو انگریز کے پٹھو ہیں۔ پچھلے دنوں ایک غلط چیز بیان کی گئی۔ کہ حضرت خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ کو مرزا سے عقیدت تھی۔ سابقہ درس میں اس پر میں نے مختصر روشنی ڈال دی ہے۔ کہ

شروع میں تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو یہ معلوم نہ ہو گا کہ اس خبیث مرزا ملعون نے لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی چار نانیاں اور دادیاں نعوذ باللہ زنا کار گزری ہیں۔ اور اس ملعون نے خود حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی نعوذ باللہ گالی دی ہے۔ اور خبیث ملعون نے یہ بھی لکھا کہ عرصہ دو سال میں مجھ پر سات لاکھ معجزے اترے ہیں۔ یہ تو حضرت کا ایک جعلی مرید تھا جس نے حضرت کی مہر لگا کر ایک تحریر ملعون قادیانی کو دیدی۔ ورنہ حضرت خواجہ رحمت اللہ علیہ کے بارے میں تو خود ملعون لکھتا ہے کہ خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ مجھے کافر کہتے ہیں۔ تو جو مجھے کافر کہتے ہیں میں ان سے مباہلہ کا چیلنج کرتا ہوں۔ اگر یہ ملعون مسلمان ہے تو پھر تمام کفار جنت میں جائیں گے۔ انشاللہ یہ مسئلہ علیحدہ کسی درس میں بیان کروں گا۔ عید کے بارے میں ذکر تھا۔ اسلام کے پانچ ارکان ہیں کلمہ کے بعد چار ہیں۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوۃ۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ مسلمان سال میں دو عیدیں منائے۔ اور عام عیدوں سے ممتاز و جدا حثیت رکھتی ہوں۔ تو نماز کے مقابلہ میں کوئی نماز عید نہیں رکھی۔ کیونکہ نماز تو دن میں پانچ مرتبہ ادا کی جاتی ہے۔ اور عید تو سالانہ چیز ہے اس لیے زکوٰۃ اور نماز میں عید کے مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی ارکان میں سے جن چیزوں کو عید کیلئے مقرر کیا۔ ایک ان میں سے روزہ اور دوسرا حج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ عید کا تعلق

اس رکن کے ساتھ ہو جس سے مسلمان کی ذاتی غرض یا نفس کا مدعیٰ و مقصد ختم ہو جائے۔ تو ان میں سے ایک روزہ ہے۔ رمضان کے تیس دن خواہش کو روزہ کی چکی میں پیستے ہیں۔ امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے ترغیب و ترھیب میں حدیث نقل کی ہے۔ اعطیت امتی فی رمضان خمس میری امت کو رمضان میں پانچ چیزیں ملی ہیں۔ لم یعطھن نبی او امت قبل۔ جو دوسرے کسی نبی یا امت کو نہیں دیگئیں۔

خلوف فم الصائم اطہر عنہ من ریح المسک۔ کہ قیامت میں روزہ دار کی مسک سے پورے محشر کے میدان میں خوشبو پھیل جائے گی۔ 2۔ یستغفر لکم الملائکہ۔ کہ ملائکہ اللہ تعالے سے روزہ داروں کے لیے بخشش مانگتے ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے آرڈر ہے۔ 3۔ وتزین لہم الجنتہ۔ اور جنت کو مزین کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح آج کسی بڑے تہوار کو قمقمے لگائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ زمین پر نہیں بلکہ عالم بالا میں جنت کے مقام میں حکم کرتا ہے۔ کہ رمضان کے شروع سے آخر تک روزہ داروں کے لیے جشن مناؤ۔ انسان اور اللہ لا محدود طاقت والے کے جشن میں کیا فرق ہوگا۔ اس جشن کا مقصد یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان روزہ داروں کو اطلاع کرو کہ یہ جشن تمہارے لیے ہو رہا ہے۔ روزہ کی پابندی کرنی چاہیئے۔ 4۔ ویستغفر لہم فی آخر لیلتہ۔ کہ رمضان کی آخری رات میں

روزہ داروں کی مغفرت ہوتی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ مزدور کو کام ختم کرنے کے بعد فوراً مزدوری دیجاتی ہے۔ اس لئے آخری رات مزدوری بخش دیجاتی ہے۔5۔ ویستغفر لہم الحیتان فی الماء۔ کہ سمندر کی مچھلیاں اپنے انداز میں روزہ دار کے لیے مغفرت کی دعا کرتی ہیں ۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ من افطر رمضان بلا عزر لم یقضہ وان صامت کلہ۔ کہ جو آدمی بلاعذر رمضان کا روزہ ترک کرے اور پھر اس کی قضا میں پوری عمر روزہ رکھے تو بھی اس کے اجر کو نہیں پہنچ سکتا ۔ حدیث۔ کہ عید کے بعد جو شوال کے چھ روزے رکھے گا۔ کان کمن صائم الدھر کلہٗ۔ اسے پوری عمر کے روزہ کا ثواب دیا جائے گا۔ دیکھو سال کے 360 دن ہوئے اور ایک نیکی کا دس گنا بدلہ بھی رکھو تو تیس تو رمضان المبارک کے ہوئے۔ اور 6 شوال کے اگر انہیں دس سے ضرب دیں تو 360 بنتے ہیں۔ تو ایک عید کو رمضان شریف سے متعین کیا گیا۔ وہ اس لیے کہ نفس کو اسلام پر ترجیح دینا منافقوں کی بنیادی چیز ہے۔ تو وہ اس روزہ سے ختم ہو جاتی ہے۔ اور قرآن پاک کا نزول بھی رمضان شریف میں ہوا۔ تو جب رمضان شریف ختم ہوا تو ہمیں اس نعمت کے مل جانے پر خوشی کے لیے عید کا تحفہ دیا گیا۔ تو تکمیلِ قرآن وتنزیلِ قرآن کیوجہ سے رمضان کے بعد عید کا حکم دیا جاتا ہے۔ یہ اصولی چیز ہے۔ عید میں کیا کام کیا جاتا ہے۔ تو پہلے صدقۃ الفطر ادا کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ

نہائیت عمدہ و اعلیٰ نظام ہے۔ تا کہ روزہ میں جو کوتاہیاں ہوئیں اس سے وہ ادا ہو جائیں گی اس کے بعد عید کی نماز رکھی وہ بھی عبادت ہے۔ کوئی گانا بجانا نہیں۔ سنت طریقہ یہ ہے کہ عمدہ کھانا کھائے عمدہ لباس پہنے۔ اور ایک راستہ سے جائے اور دوسرے راستہ سے آئے۔ تا کہ زمین کے دونوں ٹکڑے قیامت میں گواہی دیں۔

اس کے بعد دوسری عید حج کے موقع پر ہے۔ حج بھی ایک ایسی عبادت ہے کہ اس سے نفس کی خواہشات کچلی جاتی ہیں۔ (1) سفر حج کا سفر پرازخطر ہے (2) احباب سے علیحدہ ہونا۔ (3) احرام کے بعد اپنی مرغوبات سے پرہیز کرنا۔ حج میں انسان اپنی خواہشات کو کچلتا اور توڑتا ہے۔ اور حج میں کل مسلمانوں کی جوڑ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک دنیا میں دو بنیادی چیزیں ہیں ۔1۔ زمان ۔2۔ مکان۔ اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام رکھا کہ زمانہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے کچھ دن اور راتیں مقرر کیں۔ کہ رمضان کی نیکی کو یہ شرف دیا کہ سات سو (700) گنا عمل ہو گا۔ اور ذوالحجۃ کے زمانہ اور مکان کے اعتبار سے جو پہلے دس دن ہیں ان کی بڑی عظمت ہے اور پھر عجیب بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی نظر واشنگٹن اور شام کے چمنستان اور گلستان پر نہیں۔ بلکہ بوادیٍ غیر ذی ذرع ۔ کہ غیر آباد جگہ پر نظر پڑی۔ امام منذری رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حرم شریف میں

ایک نیکی کا ثواب لاکھ گنا کے برابر ہے۔ اسلئے بعض لوگ سائل کو مسجد حرام بلاکر ایک روپیہ دیتے ہیں تاکہ لاکھ کا ثواب ہو جائے۔ میں نے ایک مہاجر عالم کو یہ کرتے دیکھا۔ تو میں نے اس کو یہ حدیث دکھائی کہ مسجد کے باہر بھی ایک لاکھ کا ثواب ملتا ہے تو مان گیا۔ حدیث پاک ہے کہ حضور پاک صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی میری امت کی عمر تو کم ہے۔ اکثر عمر ساٹھ اور ستر کے درمیان ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا خیر من الف شہر۔ کہ ایک رات عزت والی دیتے ہیں۔ جسکی عبادت ہزار ماہ کی عبادت سے زائد ہے۔ یقینی بات ہے کہ اگر ایک آدمی کہے کہ ایک رات کام کرو تمہیں ایک ہزار ماہ کی تنخواہ دونگا۔ تو کتنی خوشی ہو گی۔

اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں حکمت ہے۔ کوئی تعین نہیں فرمایا۔ تاکہ انسان پورا مہینہ عبادت میں مشغول رہے۔ صرف اتنا فرمایا کہ آخری عشرہ میں تلاش کرو۔ جب حضور کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام نے مجبور کیا تو آخر آپ نے فرمایا کہ طاق راتوں میں تلاش کرو مثلاً (21۔23۔25۔27۔29۔) میں۔

علامہ الوثی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انا انزلناہ فی لیلتہ القدر۔ کہ اس سورۃ میں لیلتہ القدر کا لفظ تین بار آیا ہے۔ اور لیلتہ القدر کے 9 حروف ہیں۔ اور 9 کو 3 سے ضرب دیں تو 27 بنتے ہیں تو اس لحاظ سے 27 رمضان کی شب لیلتہ القدر کی شب بنتی

ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ محدث دہلوی نے بھی لیلتہ القدر رمضان کی 27 ویں شب کو لکھی ہے۔ اس شب میں ملائکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی ہمراہی میں اترتے ہیں۔ اور بعض عبادت کرنے والوں کے ساتھ مصافحہ بھی کرتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس رات جب دل میں نرمی پیدا ہو اور عبادت میں لطف ومزا پیدا ہو۔ تو جان لو کہ اس وقت فرشتہ نے مصافحہ کیا ہے۔

درس نمبر۱۳
22 جنوری 1967

نتائج منافقین

یاایہاالناس اعبدو..............وانتم تعلمون

منافقوں کا بیان ہو گزرا۔ اسے محض ایک قصہ نہ تصور کیاجائے۔ بلکہ سورۃ یوسف کے آخر میں ہے۔ کہ قرآن جو واقعات یا کسی قوم کی جو حالت بیان کرتا ہے۔ اس کا مقصد درسِ عبرت ہوتا ہے نہ کہ تاریخی قصہ بیان کرنا۔ عبرۃ لاولی الابصار۔ منافقوں کے حالات کے سلسلہ میں اس آیت کے تحت منافقوں کے نتائج بیان کرتے ہیں۔

(1) اخلاق گفتاروکردار۔ کہ قول وفعل میں تضاد ہو۔ کہ آدمی بولے کچھ اور کرے کچھ۔ آج کل مسلمانوں میں یہ منافقانہ عمل عام طور پر پھیل گیا ہے۔ اسے قرآن یوں بیان کرتا ہے۔ لم تقولون مالاتفعلون کبر مقتاً عند اللہ۔ جب تم وہ نہیں کرتے جو تم کہتے ہو تو اس سے اللہ تعالی کا قہر بڑھ جاتا ہے۔

آج کل بڑے بڑے لیڈروں کی چال بھی منافقانہ

ہے۔ تو منافق گفتار اور کردار میں فرق کرتے تھے۔ (2) دوسرا نتیجہ۔ دنیا کو دین پر مقدم کرتے تھے۔ منافق دل سے یہ نہ چاہتے تھے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت میں داخل ہو جائیں۔ کیونکہ پھر تو راہِ خدا میں مال بھی دینا پڑے گا اور جان بھی دینی پڑے گی۔ اور دوسری طرف جب مسلمانوں کو مالِ غنیمت ملتا دیکھا تو زبانی مسلمان بن گئے۔ تاکہ مال غنیمت کا فائدہ حاصل ہو جائے۔ مطلب یہ کہ دین کو دنیا کا تابع بنایا۔ تو یہ منافقوں کی خصلت ہوئی۔ دنیا وہ ہو جس کی دین اجازت دے۔ اخلاص یہ ہے کہ دنیا دین کی تابع ہو۔ اور نفاق یہ ہے کہ دین دنیا کے تابع ہو۔

(3) تیسرا نتیجہ یہ کہ عدمِ عظمتِ دین وعدمِ عظمتِ الٰہی۔ دین میں پختگی و مضبوطی اس وقت آتی ہے جب دین ہر چیز سے مقبول ہو۔ اور جس کا دین ہے وہ سب سے زیادہ محبوب ہو۔ ورنہ دین میں پختگی نہیں آسکتی۔ تو منافقت کا تیسرا نتیجہ یہ کہ اللہ اور اس کے دین کی عظمت دل سے ختم ہو جاتی ہے۔ حضرت ابو طلحہؓ کے بارے میں بخاری شریف کی حدیث ہے۔ یہ صحابیؓ مسجد نبوی کے قریب سب سے زیادہ امیر تھے۔ ان کا ایک باغ تھا اس کے اندر میٹھا پانی تھا۔ جب لن تنال البر حتی تنفقوا۔ کی آیت نازل ہوئی۔ کہ جب تک تم پیاری سے پیاری چیز اللہ کی راہ میں قربان نہ کرو تو مومن نہیں بن سکتے۔ بس یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت نبی کریم صلے اللہ

علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں آئے اور عرض کی کہ یا نبی اللہ یہ باغ مجھے بہت عزیز ہے۔ اسے میں آپکے سپرد کرتا ہوں کہ جسے چاہیں تقسیم فرما دیں۔ تو حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ مال تو بہت اچھا ہے۔ اسے رشتہ داروں میں تقسیم کر دو۔ تو تقسیم کر دیا گیا۔

(4) چوتھا نتیجہ۔ معیار عزت دین ہے۔ مال نہیں ہے۔ قرآن۔ کہ سن لو خوب سن لو کہ اگر آسمان وزمین پورا سونا ہو جائے اور ایک شخص کی ملکیت ہو اور ایمان نہ ہو تو وہ سونا پاخانہ کے برابر نہیں۔ مگر منافقوں کے ہاں معیار عزت مال تھا۔ قالوا انؤمن کما امن السفہاء۔ منافق۔ صحابہ کرامؓ اور مخلص مسلمانوں کو مال نہ ہو۔ نے کی وجہ سے بیوقوف جانتے تھے۔ عزت کا مدار مال پر نہیں۔ دین پر ہے۔ فرعون۔ نمرود اور شداد کے پاس مال تھا مگر اللہ تعالیٰ کے قہر میں تھے۔ اور حضرت بلالؓ اللہ تعالیٰ کے ہاں عزیز تھے۔ مگر ان کے پاس مال نہ تھا۔ تو عزت کا دارو مدار مال پر نہیں دین پر ہے۔ کفار دیکھتے تھے کہ صحابہ کرامؓ کے پاس نہ رقم ہے نہ پیسہ مگر دین میں اتنے مست ہیں کہ قیصر و کسریٰ پر تھوکتے بھی نہیں۔ تو ان کی زبان سے بلا رکاوٹ نکلتا تھا۔ غرّ ھؤلاء

(5) پانچواں نتیجہ یہ کہ منفعتِ فوریہ کو منفعتِ دائمہ پر قربان کر دے۔ مگر منافق دائمی منفعت کو فوری منفعت پر قربان

کردیتا ہے فلما اضاءت ماحولہ۔ کہ پوری دنیا ایسی ہے کہ چنگاری چمکی اور بجھی۔ مگر دین کا فائدہ اور چمک ہمیشہ کیلئے ہے۔ تو چاہیئے تو یہ کہ دائمی فائدہ کو اختیار کرے۔ چاہے چند روزہ زندگی میں نقصان بھی ہو۔ مگر منافق دائمی فائدہ کو عارضی فائدہ پر قربان کرتا ہے۔

(6) چھٹا نتیجہ۔ یہ مثال دوم او کصیب من السماء سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ ایک عظیم چیز ہو مگر اس عظیم نفع مند سے محروم ہونا۔ یہ بارش والی مثال سے معلوم ہوتا ہے۔ بارش برسی اس کے فائدہ میں تو کوئی شک و شبہ نہیں۔ مگر منافقوں کے دلوں میں الٹا اثر ہوتا ہے کہ گرج کے وقت کان میں انگلی دیدی۔ تو ایک قرآن کی بارش ہے۔ جب قرآن کی بارش برسی۔ تو جو بھی اس کے فائدے سے محروم ہو گا۔ تو وہ منافقوں کی مثل ہو گیا۔ کہ کانوں میں انگلی دیدی۔ اثر قبول نہیں کیا۔

(7) ساتواں نتیجہ۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں جس کام کے لیے دی ہیں۔ اگر ان سے وہ کام نہ لیا جائے تو یہ سمجھو کہ یہ قوتیں ہیں ہی نہیں۔ قوت گویائی حق بیان کرنے کیلئے۔ قوت شنوائی دین سننے کے لیے۔ اور قوت بینائی دین دیکھنے کے لیے عطا کی گئی ہیں۔ اگر ان سے ان کا اصل مقصد نہ لیا گیا۔ تو گو کہ یہ چیزیں انسان کو کام دے رہی ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک بیکار ہیں اور گویا کہ ہیں ہی نہیں۔

الف - لام - م سے یاایہاالناس تک - مکلفین یا اولاد آدم کی تین قسمیں بیان ہوئی ہیں -

یعنی جن لوگوں کو دین پر چلنے کی تکلیف دی گئی ہے - وہ تین ہیں - (1) متقین - (2) کافرین - (3) منافقین -

متقین - جو اندرو باہر - ظاہر و باطن میں مسلمان ہیں -

کافرین - وہ جو اندرو باہر - ظاہر و باطن میں کافر ہیں -

منافقین - وہ جو اندر و باطن سے کافر اور باہر و ظاہر سے مسلمان ہوں - یہ گروہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کافروں سے بد ترین ہیں - کیونکہ ان سے بہت نقصان ہوتا ہے -

ان مکلفین کے بعد - احکام متکلفیہ ہیں - اور وہ یہ ہیں - (1) توحید فی العبادت - (2) نبوت (3) آخرت - نبوت سے مراد یہ کہ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر یقین رکھنا - پہلی چیز توحید جو یا ایہاالناس اعبدو سے تعلمون تک بیان ہوئی ہے - اور وان کنتم فی ریب مما نزلنا سے نبوت کا بیان ہے - اور فان لم تفعلوا ولن تفعلو - سے کلما رزقوا تک آخرت کا بیان ہے گویا یہاں تک سارے اسلام کا نچوڑ بیان کیا گیا - یہ قرآن کا اپنا ایک نرالہ انداز ہے -

یا ایہاالناس اعبدوا ربکم - اے انسانو اپنے پالنے والے کی عبادت کرو - جس نے خود تم کو اور جس سے تم پیدا

ہوئے ہو۔ان کو پیدا کیا ہے۔تا کہ تم اس سے ڈرو اور اطاعت کرو۔(نہ کہ دنیا کی غرض وغایت میں مست ہو جاؤ) وہ وہ ذات ہے جس نے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا۔ اور اس سے پانی برسایا۔ اور تمہارے لیے پھل نکالے۔ تم اس کا شریک نہ بناؤ۔

یاایہاالناس سے رب تعالیٰ نے پکارا ہے۔ اب تک جتنی بات چل رہی تھی وہ غائبانہ انداز میں چل رہی تھی۔ مگر اب آمنے سامنے خطاب فرمایا ہے کہ اے لوگو۔

آج اگر کوئی حاکم آمنے سامنے بات کرنے کا موقع دے تو لوگ فخر سمجھتے ہیں۔ اب تک متقین۔ کفار اور منافقین کا جو بیان گزرا ہے اس میں خطاب کی صورت نہ تھی۔ مگر اب خطاب فرمایا۔ تاکہ انسان براہ راست اور آمنے سامنے کلام کرنے کی وجہ سے شرمندہ ہو کر عبادت کرے۔ اگر حاکم خود بلا کر یہ حکم کرے کہ تم فلاں کام کرو۔ تو یہ بات اس بات سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔ جو بات کسی ملازم کے ہاتھ حکم بھیج کر کی جائے۔

اور آمنے سامنے کلام میں تیسری حکمت غالباً یہ کہ۔ الناس کا لفظ فرمایا۔ اولاد آدم کا لفظ نہیں فرمایا۔ عربی میں الناس کے دو معنی نکلتے ہیں۔ ایک انس۔ دوم نسیان۔

تو الناس۔ فرما کر یہ بیان کیا کہ الناس۔ انس اور الفت سے مشتق ہے۔ تو تمہاری فطرت الفت اور محبت رکھنی

ہے۔ اور فطری بات یہ ہے کہ جس کی نعمت زیادہ ہے۔ اس سے محبت زیادہ ہو۔ اور سب سے زیادہ نعمت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ تو جو زیادہ محبوب ہو اسکے حکم کی زیادہ تعمیل کی جاتی ہے۔ اور الناس۔ کا دوسرا پہلو نسیان کا ہے۔ یعنی بھول۔ یہ بھی انسان کی فطرت میں داخل ہے

الانسان مرکب من الخطاء و النسیان۔ تو الناس فرما کر بھول کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ اے انسان تیری فطرت میں بھول تو ہے۔ لیکن تو عبادت کو نہ بھولنا۔

اس سلسلہ میں کچھ بیان کرتا ہوں۔ دیکھو اگر پوری دنیا نیک یا بد بن جائے تو اللہ تعالیٰ کو نہ فائدہ ہے نہ نقصان۔ لیکن اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح انسان کا فائدہ ہو جائے۔ اس لیے کسی نہ کسی طرح عبادت کو مقرر کر دیا۔

(1) خالقیت، ربوبیت عامہ۔ (2) خالقیت انسان، کہ خود انسان کو اس نے بنایا۔ (3) خالقیت والدین۔ (4) خالقیت ارض و سماء۔ (5) خالقیت نباتات۔ اللہ تعالیٰ کی عظیم شان ہے کہ جب وہ عبادت کا حکم دیتے ہیں تو ساتھ ساتھ اپنی پانچ چیزوں کا جو احسانات کئے ہیں بیان فرماتے ہیں۔ تاکہ عبادت میں غفلت۔ نسیان۔ اور بھول چوک نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو عبادت کا حکم دیا ہے اس سلسلے میں دو چیزیں اہم ہیں۔ بندے کا نام عبد۔ اور اللہ

تعالیٰ کا نام معبود۔ قرآن میں عبدیت کی دو قسم ہیں (1) پیدائش بندگی۔ یعنی عبدیت تکوینی۔ (2) عبدیت تشریعی۔ عبدیت تکوینی تو عمومی ہے۔ جو تمام عالم کو شامل ہے۔ تو عبدیت تکوینی کے لحاظ سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کی غلامی میں ہے۔ تدبیر اور عالم اسباب یہ حکم الہی پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ ہے عبدیت تکوینی۔ جس میں پورا عالم بندگی میں جکڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بندگی مقصود نہیں۔ کیونکہ یہ تو پہلے سے ہے۔ کوئی اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا باقی اللہ تعالیٰ نے عبدیت تشریعی چاہی۔ کہ نماز۔ روزہ۔ حج۔ وغیرہ ان میں ہمیں اختیار ہے کہ کریں یا نہ کریں۔ ان کل من فی السموات والارض الاآت الرحمن عبداً۔

تو معلوم ہو گیا کہ عبدیت تکوینی پہلے سے ہے اور عالم گیر ہے۔ اس کا مطالبہ نہیں کیا جا رہا۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں سے جو چیز طلب کی جا رہی ہے وہ عبدیت تشریعی ہے۔

اقسامِ بندگی

درس نمبر ۳۲

اتوار ۲۹ جنوری ۱۹۶۷ء

یا ایها الناس اعبدوا .... اندادا و انتم تعلمون۔

بندوں کی تین قسمیں بیان ہوئیں۔ متقین۔ منافقین۔ کافرین۔

اب بندگی کی قسمیں بیان کرتا ہوں۔

(۱) پہلی چیز عبادت ہے۔ عبادت شریعت میں انسان کے دل کے اس جذبہ کا نام ہے جس میں وہ اپنی ذات کی انتہائی ذلت و پستی اور اللہ تعالیٰ کی عظمت محسوس کرے۔ اس میں ہم عبد کہلائے۔ اور اللہ تعالیٰ معبود۔

پھر عبادت کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ جبری بندگی۔ ۲۔ اختیاری بندگی۔

۱۔ جبری بندگی۔

کہ آسمان سے زمین تک تمام چیزیں جبری بندگی کر رہی ہیں۔ زمین و آسمان۔ ستارگان۔ موت و زندگی تو جبری ہیں۔ ان کل من فی السموت و الارض الا اتی الرحمن عبدا۔ کہ اللہ تعالیٰ جو کرنا چاہے اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ یہ تو جبری بندگی ہے۔

۲۔اختیاری بندگی۔

کہ پیغمبر علیہ السلام کے ذریعہ اطلاع ملی کہ فلاں چیز اختیار کرو اور فلاں اختیار نہ کرو۔

اعبدوا ۔ سے اختیاری بندگی مقصود ہے۔عجیب ہے کہ بندگی کا حکم دیا۔تو اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ بندگی کرنا آسان نہیں۔تو ساتھ اللہ تعالیٰ نے چھ انعامات ذکر فرمائے۔کہ اگر ان چھے انعامات کا تصور کرو تو بندگی کرنا آسان ہو جائے گا۔

ا۔ربوبیت۔

ربوبیت اعبدوا ربکم ۔کہ وہ تمہارا مربی ہے۔پرورش کرنے والا ہے۔اگر اس کی پرورش ایک سیکنڈ ہٹ جائے تو تم زندہ نہیں رہ سکتے۔تو کیا ایسی ذات عبادت کے قابل نہیں ہے؟ یہ پہلا انعام ہوا۔ربوبیت کو سب سے پہلے لایا گیا۔اس سے یہ نکتہ طے ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے پیدائش سے پہلے پرورش کا سامان پیدا کر دیا۔کہ پیدائش سے پہلے زمین و آسمان۔روشنی کے لیے سورج و چاند۔اور کھانے کے لیے پھل وغیرہ پیدا کئے۔یہ سب کچھ انسان کی پیدائش سے قبل تیار تھا۔

۲۔ خالقیت۔

خلقکم ۔کہ خدا وہ ہے جس نے خود تمہیں پیدا کیا۔انسان کو اپنے نفس سے ایک خاص تعلق ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے نفس کو پہلے ذکر کیا اور بعد میں ماں باپ سے تعلق ہوتا ہے تو اس لیے ان کا نام دوم درجہ پر ذکر کیا۔

۳۔ تیسری چیز یہ کہ انسان کو زمین سے تیسرے نمبر پر تعلق ہے۔کہ اس زمین سے

پیدا ہوا۔ اس پر زندگی گزاری یعنی زمین کو انسان کا مسکن بنایا کہ وہ اس پر بود و باش کے علاوہ ضروریاتِ زندگی اس سے حاصل کرتا رہے پھر مرنے کے بعد دفن بھی اسی میں ہوا۔ الم نجعل الارض کفاتاً۔ کہ ہم نے زمین کو تمہارے ملانے کے لیے نہیں بنایا۔ کہ مرنے اور جینے میں ملائی رہتی ہے۔ منها خلقنا کم و منها نعید کم۔ کہ تم اس سے پیدا ہوئے اور اسی میں لوٹ کر جاؤ گے۔

۴۔ چہارم نمبر پر انسان کو آسمان سے تعلق ہے۔ اس اعتبار سے کہ اگر سورج نہ ہوتو سب جاندار ختم ہو جائیں۔

۵۔ پانچویں نمبر پر بارش نازل فرمائی اور چھٹے نمبر پھلوں وغیرہ کا رزق عطا فرمایا۔ وانزل من السماء ماءً فاخرخ به من الثمرات رزقا۔ تو زمینی پیداوار کا تعلق آسمان و زمین کے ساتھ مرکب ہے۔

اس کے بعد نتیجہ مرتب کیا کہ یہ چھ چیزیں بتلائی ہیں تم آنکھیں کھول کر دیکھ لو۔ اور خوب سمجھ لو کہ ان کو بنانے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ تو یاد رکھو کہ عبادت اس کی کرنی چاہیے جو یہ چھے کام کرے۔ اور اگر کوئی کرنے والا نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کا شریک نہ کرو۔

یہاں پر دو چیزیں فلسفیانہ لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ کہ قرآن نے زمین کو فرش بیان کیا ہے۔ تو لوگوں کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ زمین گول نہیں۔ بلکہ شریعت اور حکمت یعنی فلسفہ دونوں زمین کے گول ہونے پر متفق ہیں۔ تو بعض لوگ فرش کے بیان ہونے سے یہ غلط فہمی نہ لیں کہ زمین گول نہیں۔ یہ غلط ہے۔ کیونکہ یہ تو زمین کو فرش سے تشبیہ دی گئی ہیں۔ نہ کہ عین فرش کہا گیا ہے۔ دیکھو فرش پر آدمی بیٹھ سکتا ہے اور زمین پر بھی بیٹھ سکتا

ہے۔ وغیرہ۔ اگر اللہ تعالیٰ زمین کو فرش نہ بناتا۔ تو زمین پر یہ چیزیں ممکن نہ ہوتیں۔ اگر زمین پانی کی طرح نرم ہوتی تو آدمی اس سے یہ کام نہ لے سکتا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اسے لوہے کی طرح سخت بناتا۔ تو پھر بھی یہ فرش کا کام نہ دیتی۔ کیونکہ فرش کے لیے نہ صرف سختی اور نہ صرف نرمی چاہئے۔ باقی یہ کہ زمین فراخ ہے۔ تو گول چیز اگر بہت وسیع ہو تو اس کے بعض حصے مسطح ہو سکتے ہیں۔ اور سطح اور فرش کی طرح چوکور بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے زمین پر فرش کا اطلاق منع نہیں۔ باقی یہ کہ فلسفہ اور شرعی اعتبار سے زمین گول ہے۔ اور اگر زمین گول نہ ہوتی تو طلوعات اور غروبات میں فرق نہ ہوتا۔ جہاں نکلتا تو پوری دنیا میں نکلتا۔ اور اگر گول ہو تو پھر ہر جگہ ایک ہی وقت میں طلوع وغروب نہیں ہو سکتا۔

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ فطرت بتلاتا ہے۔ فطرت سے ٹکراتا نہیں۔ مشرق میں طلوع وغروب دونوں مقدم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ مشرق والوں کو سورج و چاند طلوع وغروب میں پہلے نظر آئے گا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے حوالہ سے فقہی مسائل پر اکتفاء کرتا ہوں۔ یہ تو آپ کو پہلے معلوم ہے کہ اگر دو بھائی ہوں اور ان کا کوئی وارث نہ ہو تو۔ جو پہلے مرے گا۔ اسے مورث کہتے ہیں۔ اور جو بعد میں مرتا ہے اسے وارث کہتے ہیں۔

تو فتح العزیز میں فقہاء سے نقل کیا ہے کہ اگر ایک بھائی چین میں اور دوسرا اندلس میں رہتا ہو تو چین مشرق کو قریب ہے اور اندلس مغرب کو قریب ہے۔ ان دونوں کا مقام الگ الگ ہے۔ اور دونوں عین طلوعِ آفتاب کے وقت مر گئے۔ تو ظاہری طور پر دونوں ایک ہی وقت میں مرے ہیں۔ تو اس صورت میں تو کوئی وارث نہیں ہے۔ اگر آگے پیچھے مریں تو پھر وارث بنتے ہیں۔ تو فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اس وقت چین والا

بھائی پہلے مرا اور سمرقند اندلس میں رہنے والا بھائی بعد میں مرا۔ تو اندلس والا اس کا وارث ہوا۔

دیکھو فقہاء حضرات نے تو بہت کوشش کر کے مسائل حل کئے ہیں۔ مگر آج قرآن بھی غلط پڑھتے ہیں اور دین بھی نہیں سمجھتے۔ مگر فقہاء حضرات کو بُرا بھلا کہنے اور گالی دینے میں پیش پیش ہیں۔

خدا انگریزی تعلیم کا بُرا کرے کہ اس نے کھوپڑیاں ایسی بگاڑی ہیں کہ نہ دین جانتے ہیں اور نہ فطرت۔ اور جو دین وفطرت جانتے ہیں انہیں غلط بتاتے ہیں۔

آج کل ان کو ایک اور بھوت سوار ہو رہا ہے۔ وہ یہ کہ کہتے ہیں کہ ہر جگہ عید ایک ہی دن ادا کی جائے۔ یعنی عالم اسلام کی عید اور روزہ ایک ہی دن ہو۔ یہ تو بے وقوفی ہے۔ کیونکہ جغرافیائی فرق تو ایک فطرتی تقاضا ہے۔ آج ہم انہیں صحیح صورت بتاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ مولوی فساد پیدا کر رہے ہیں۔

دیکھو جب یہ مسئلہ واضح ہے کہ ہزار میل کے فاصلے پر طلوع وغروب میں ایک گھنٹہ کا فرق ہوگا۔ جب دو شہر شرقاً وغرباً واقع ہوں تو فاصلے کے لحاظ سے سورج کو بھی تو وقت چاہئے۔ مثلاً پشاور اور لاہور میں خط مستقیم کے اعتبار سے بیس منٹ کا فرق ہے۔ مگر آج ہمارا مسٹرانہ دماغ یہ کہے کہ عالم اسلام کی عید اور رزہ ایک دن ہوں۔ کیا یہ بیوقوفی نہیں؟

تو قرآن یہ کہتا ہے کہ ہم تو بندۂ خدا ہیں۔ ہم تو صرف اسی کے حکم پر چلیں گے۔ فمن شهد منكم الشهر فليصمه۔ کہ جو دیکھے تم میں سے وہ روزہ کر لے۔

حدیث شریف میں بھی رؤیت پر مدار رکھا ہے۔ تو چونکہ ہر آدمی رؤیت تو نہیں

کر سکتا۔ تو نسائی شریف میں ایک لفظ زیادہ کیا گیا۔ کہ خود نہ دیکھ سکو تو اگر دو آدمی دیکھ لیں تو تب بھی روزہ رکھو اور روزہ کھولو۔ شرعاً روزہ رکھنے کے لیے اگر مطلع ابر آلود ہو تو ایک معتبر آدمی کی گواہی بھی کافی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے۔ تو مشرق میں پہلے نظر آئے گا اور مغرب میں بعد میں نظر آئے گا۔

اگر مشرق والوں کو نظر نہ آئے کیونکہ غروب ہو چکا تھا۔ اور مغرب والوں کو نظر آ جائے کیونکہ وہاں تو بعد میں ڈوبتا ہے۔ بس جو دیکھے وُہ کرے۔

بلغار۔ ایک علاقہ ہے وہاں جب سورج ڈوب جاتا ہے تو چند منٹ کے بعد صبح صادق کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ تو فقہاء لکھتے ہیں کہ جس نے عشاء کی نماز کا وقت نہیں پایا اس کی چار نمازیں ہیں۔ پانچ نہیں۔ کیونکہ وہاں وقت ہی نہیں۔

اولادِ آدم۔ ربع مسکون۔ یعنی دنیا کے شمالی حصے پر آباد ہے۔ یہ ہے پوری دنیا۔ تو جو خط استواء انڈونیشیاء سے گزرتا ہے اس سے شمال جانب میں ۹۰ درجہ پر قطب کے قریب چھ ماہ رات اور چھ ماہ دن ہے۔

آدمی ٦٦ درجہ پر رہ سکتا ہے۔ اگر آدمی اس سے آگے چلا جائے تو ٹھنڈ کی وجہ سے مر جائے۔ فقہاء نے درمختار اور ردالمختار میں لکھا ہے کہ یہاں نہ روزہ ہے اور نہ نماز ہے۔

مگر دوسرا قول یہ ہے کہ عام ملکوں کے وقت کی پابندی کرے روزہ اور نماز ادا کرے۔ مثلاً عام ملکوں میں دیکھے کہ رات اور دن کتنے گھنٹے کے ہیں۔ تو چھ ماہ والے دن میں ۱۲ گھنٹے روزہ رکھے اور ۱۲ گھنٹے خوب کھائے پیئے۔

دیکھو یہاں آدمی جا تو نہیں سکتا مگر فقہاء نے (فرض) کر کے مسئلہ واضح کر دیا

ہے۔تا کہ اگر انسان کسی مشین کے ذریعے چلا بھی جائے تو مسئلہ واضح ہو۔

مگر پتہ نہیں ان لوگوں کو کیا بیماری پڑی ہے کہ اس کوشش میں ہیں کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی عید ایک ہی دن ہو۔

کریب نے کہا کہ مجھے ام فضلؓ نے شامؔ کے علاقے میں بھیجا۔ یہ ام فضل کے آزاد کردہ غلام تھے۔ جب میں شام کے سفر سے مدینہ منورہ واپس آیا تو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے پوچھا کہ وہاں رمضان شریف کا چاند کب دیکھا گیا۔ میں نے بتلایا فلاں دن۔ تو آپ نے فرمایا ہم نے تو ایک دن بعد دیکھا۔ اور ہم نے ایک دن بعد روزہ رکھا۔ تو کریب نے کہا کہ صام معاویۃؓ وصام الناس۔ کہ امیر المومنین حضرت معاویہؓ نے اور رعایا نے روزہ رکھا۔ مگر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا ہم نے جس دن دیکھا اسی دن روزہ رکھا۔ تو اس کے بعد کریب آپ سے پوچھتا ہے کہ اگر شامؔ کے اعتبار سے تیس روزے پورے ہو جائیں تو کیا آپ عید کریں گے!

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا لا نفطر حتی نراہ ۔ کہ جب تک ہم چاند نہ دیکھیں گے روزہ افطار نہیں کریں گے۔ (حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا کہ یہ امت کا بڑا عالم اور مترجم القرآن ہے)۔

تو دین قانون قدرت کے مطابق ہے۔ لا تبدیل لکلمات اللہ ۔ ترجمہ۔ اللہ کے کلمات تبدیل نہیں ہوتے۔ اس جگہ اس مسئلہ کے بیان کی ضرورت تو نہ تھی مگر فراشؔ کی شرح میں اسے بھی ذکر کر دیا۔

آگے دوسرا مسئلہ جو فلسفی طریقہ سے حل طلب ہے۔ وہ یہ ہے کہ بارش آسمان

سے نازل ہوتی ہے۔ یا کہ بادل سے؟ تو قرآن پاک میں دونوں الفاظ ہیں۔
فتشیر مسحاباً فسقنا. الی بلد میت کہ بادل کو ہوا سے اڑا کر خشک شہر پر
برساتے ہیں۔

آسمان۔اور بادل۔ بلکہ چھت کو بھی عربی میں سماء کہا جاتا ہے۔
فلیمدد بسبب اس جگہ سماء سے بالاتفاق چھت مراد لی گئی ہے۔تو سماء بادل بھی ہوسکتا
ہے۔

دوم یہ کہ اگر سماء سے آسمان مراد ہو تو یہ بھی درست ہے۔ دیکھو سائنس والے
کھلے اور واضح اسباب معلوم کر سکتے ہیں۔اور جو اسباب پوشیدہ ہیں وہ خدا تعالیٰ کو معلوم
ہیں۔

دیکھو بادل اور بارش میں آسمان کو دخل ہے۔سائنسدان کہتے ہیں کہ سورج
کے شعلے سمندر سے بخارات ابھارتے ہیں جو اوپر جا کر بادل بن جاتے ہیں۔تو اگر
آسمان نہ ہوتا تو سورج بھی نہ ہوتا۔تو بادل کہاں ہوتے۔

ایک روایت میں نقل ہے کہ بارش میں آسمان کے پانی کا بھی تعلق ہے۔مثلاً
آب زمزم میں اگر دوسرا پانی شامل کر دیں تو سارا متبرک ہو جاتا ہے۔اسی طرح بارش
کے پانی میں آسمان کا پانی ڈالا جاتا ہے۔تا کہ برکت ہو جائے۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ شاید اگر بارش مین آسمانی پانی شریک نہ
ہوتا تو جتنی بھی بارشیں ہوتیں زمین سے کوئی چیز نہ اگئی۔

تیسری چیز۔یعنی تیسری توجیہ یہ کہ۔چلو یہ بارش صرف بادل سے برسے۔تو
کیا یہ خود بخود برستی ہے۔یا اسے کوئی حکم دیتا ہے۔

دیکھو بعض اوقات بادل ہوتے ہیں مگر بارش نہیں برستی۔ اور اگر برستی ہے تو پھر رکتی نہیں۔ اور پھر ہماری مرضی کی جگہ پر نہیں برستی۔ معلوم ہوگیا کہ یہ کسی کے حکم کے ماتحت ہے۔ جب تک اسے حکم نہ ملے تو یہ خود بخود نہیں برستی۔ حدیث پاک ہے کہ زمین میں جتنے کام ہوتے ہیں۔ ان کا دفتر سدرۃ المنتہیٰ پر ہے۔ وہیں سے احکامات جاری ہوتے ہیں۔

ایک آدمی نے مجھے کہا۔ دعا کرو اللہ تعالیٰ بارش کریں۔ میں نے کہا مجھ سے نیک اور بھی ہیں۔ ان سے دعاء کراؤ۔ کیونکہ نیک آدمی کی دعاء اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں (وبشومہ) کہ جب حکمران ناانصاف اور بداعمال ہوجائیں۔ تو اللہ تعالیٰ بارش برسانا بند کردیتا ہے۔

تو اب گورنمنٹ کو چاہئے کہ اسلامی قانون نافذ کر کے غریبوں کی امداد کرے۔

کیا اگر ایک مالک اپنے غلام کو رقم دے اور وہ اسے غلط راستہ پر برباد کردے تو وہ اسے دوبارہ رقم دے گا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اسے سزا دے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں روزی دی۔ ہم نے اس کی بے قدری کی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہم سے چھین لی۔

اسی طرح بارش بھی روزی ہے۔ کیونکہ ہر چیز اس سے وابستہ ہے۔ **وجعلنا من الماء کل شی حیی**۔ ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندگی بخشی ہے۔

تو ہم نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کو غلط راستہ پر استعمال کیا تو اس لیے اللہ تعالیٰ نے بارش کی نعمت چھین لی۔

درس نمبر ۳۲

اتوار ۲۹ جنوری ۱۹۶۷ء

اقسامِ بندگی

یاایھا الناس اعبدوا..........اندادو انتم تعلمون۔

بندوں کی تین قسمیں بیان ہوئی ہیں۔

(۱) متقین (۲) منافقین (۳) کافرین۔

اب بندگی کی قسمیں بیان کرتا ہوں۔

(۱) پہلی چیز عبادت ہے۔ عبادت شریعت میں انسان کے دل کے اس جذبہ کا نام ہے جس میں وہ اپنی ذات کی انتہائی ذلت و پستی اور اللہ تعالیٰ کی عظمت محسوس کرے۔ اس میں ہم عبد کہلائے۔ اور اللہ تعالیٰ معبود۔

پھر عبادت کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) جبری بندگی (۲) اختیاری بندگی

(۱) جبری بندگی:۔ کہ آسمان سے زمین تک تمام چیزیں جبری بندگی کر رہی ہیں۔ زمین و آسمان۔ ستارگان۔ موت و زندگی تو جبری ہیں۔ ان کل من فی السمٰوٰت والارض الا اتی الرحمن عبدا ۔ کہ اللہ تعالیٰ جو کرنا چاہے اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ یہ تو جبری بندگی ہے۔

(۲) اختیاری بندگی:۔ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ذریعہ اطلاع ملی کہ فلاں چیز اختیار کرو اور فلاں اختیار نہ کرو۔

اعبدوا ۔ سے اختیاری بندگی مقصود ہے۔ عجیب ہے کہ بندگی کا حکم دیا۔ تو اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ بندگی کرنا آسان نہیں۔ تو ساتھ اللہ تعالیٰ نے چھ انعامات ذکر فرمائے۔ کہ اگر ان چھ انعامات کا تصور کرو تو بندگی کرنا آسان ہو جائے گا۔

(۱) ربوبیت: اعبدوا ربکم۔ کہ وہ تمہارا مربی ہے۔ پرورش کرنے والا ہے۔ اگر اس کی پرورش ایک سیکنڈ ہٹ جائے تو تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ تو کیا ایسی ذات عبادت کے قابل نہیں ہے؟ یہ پہلا انعام ہوا۔

ربوبیت کو سب سے پہلے لایا گیا۔ اس سے یہ نکتہ طے ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے پیدائش سے پہلے پرورش کا سامان پیدا کر دیا۔ کہ پیدائش سے پہلے زمین و آسمان۔ روشنی کے لیے سورج و چاند۔ اور کھانے کے لیے پھل وغیرہ پیدا کیے۔ یہ سب کچھ انسان کی پیدائش سے قبل تیار تھا۔

(۲) خالقیت: خلقکم۔ کہ خدا وہ ہے جس نے خود تمہیں پیدا کیا۔ انسان کو اپنے نفس سے ایک خاص تعلق ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے نفس کو پہلے ذکر کیا۔ اور بعد میں ماں باپ سے تعلق ہوتا ہے تو اس لیے ان کا نام دوم درجہ پر ذکر کیا۔

(۳) تیسری چیز یہ کہ انسان کو زمین سے تیسرے نمبر پر تعلق ہے۔ کہ اس زمین سے پیدا ہوا۔ اس پر زندگی گذاری یعنی زمین کو انسان کا مسکن بنایا کہ وہ اس پر بود و باش کے علاوہ ضروریات زندگی اس سے حاصل کرتا رہے پھر مرنے کے بعد دفن

بھی اسی میں ہوا۔ **الم نجعل الارض کفاتاً**۔ کہ ہم نے زمین کو تمہارے ملانے کے لیے نہیں بنایا۔ کہ مرنے اور جینے میں ملائی رہتی ہے۔ **منها خلقناكم و فيها نعيدكم**۔ کہ تم اس سے پیدا ہوئے اور اسی میں لوٹ کر جاؤ گے۔

(۴) چہارم نمبر پر انسان کو آسمان سے تعلق ہے۔ اس اعتبار سے کہ اگر سورج نہ ہو تو سب جاندار ختم ہو جائیں۔ **وانزل من السماء ماءً فاخرج به من الثمرات رزقاً**۔

(۵) پانچویں نمبر بارش نازل فرمائی اور

(۶) چھٹے نمبر پر پھلوں وغیرہ کا رزق عطا فرمایا۔ تو زمینی پیداوار کا تعلق آسمان و زمین کے ساتھ مرکب ہے۔

اس کے بعد نتیجہ مرتب کیا کہ یہ چھ چیزیں بتلائی ہیں تم آنکھیں کھول کر دیکھ لو۔ اور خوب سمجھ لو کہ ان کو بنانے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ تو یاد رکھو کہ عبادت اس کی کرنی چاہیے جو یہ چھ کام کرے۔ اور اگر کوئی کرنے والا نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کا شریک نہ کرو۔

یہاں پر دو چیزیں فلسفیانہ لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ کہ قرآن نے زمین کو فرش بیان کیا ہے۔ تو لوگوں کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ زمین گول نہیں۔ بلکہ شریعت اور حکمت یعنی فلسفہ دونوں زمین کے گول ہونے پر متفق ہیں۔ تو بعض لوگ فرش کے بیان ہونے سے غلط فہمی نہ لیں کہ زمین گول نہیں۔ یہ غلط ہے۔ کیونکہ یہ تو زمین کو فرش سے تشبیہ دی گئی ہے۔ نہ کہ عین فرش کہا گیا ہے۔ دیکھو فرش پر آدمی بیٹھ سکتا ہے۔ اور زمین پر بھی

بیٹھ سکتا ہے۔ وغیرہ۔ اگر اللہ تعالیٰ زمین کو فرش نہ بناتا۔ تو زمین پر یہ چیزیں ممکن نہ ہوتیں۔ اگر زمین پانی کی طرح نرم ہوتی تو آدمی اس سے یہ کام نہ لے سکتا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اسے لوہے کی طرح سخت بناتا۔ تو پھر بھی یہ فرش کا کام نہ دیتی۔ کیونکہ فرش کے لیے نہ صرف سختی اور نہ صرف نرمی چاہیے۔ باقی یہ کہ زمین فراخ ہے۔ تو گول چیز اگر بہت وسیع ہو تو اس کے بعض حصے مسطح ہو سکتے ہیں اور سطح اور فرش کی طرح چوکور بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے زمین پر فرش کا اطلاق منع نہیں۔ باقی یہ کہ فلسفہ اور شرعی اعتبار سے زمین گول ہے۔ اگر زمین گول نہ ہوتی تو طلوعات اور غروبات میں فرق نہ ہوتا۔ جہاں نکلتا تو پوری دنیا میں نکلتا۔ اور اگر گول ہو تو پھر ہر جگہ ایک ہی وقت میں طلوع و غروب نہیں ہو سکتا۔

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ فطرت بتلاتا ہے۔ فطرت سے ٹکراتا نہیں۔ مشرق میں طلوع و غروب دونوں مقدم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ مشرق والوں کو سورج و چاند طلوع و غروب میں چاند پہلے نظر آئے گا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے حوالہ سے فقہی مسائل پر اکتفاء کرتا ہوں۔ یہ تو آپ کو پہلے معلوم ہے کہ اگر دو بھائی ہوں اور ان کا کوئی وارث نہ ہو تو جو پہلے مرے گا۔ اسے مورث کہتے ہیں۔ اور جو بعد میں مرتا ہے اسے وارث کہتے ہیں۔

تو فتح العزیز میں فقہاء نے نقل کیا ہے کہ اگر ایک بھائی چین میں اور دوسرا اندلس میں رہتا ہو تو چین مشرق کو قریب ہے اور اندلس مغرب کو قریب ہے۔ ان دونوں کا مقام الگ الگ ہے۔ اور دونوں عین طلوعِ آفتاب کے وقت مر گئے۔ تو

ظاہری طور پر دونوں ایک ہی وقت میں مرے ہیں۔ تو اس صورت میں تو کوئی وارث نہیں ہے۔ اگر آگے پیچھے مریں تو پھر وارث بنتے ہیں۔ تو فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اس وقت میں چین والا بھائی پہلے مرا اور سمرقند یعنی اندلس میں رہنے والا بھائی بعد میں مرا۔ تو اندلس والا اس کا وارث ہوا۔

دیکھو فقہاء حضرات ؒ نے تو بہت کوشش کر کے مسائل حل کئے ہیں۔ مگر آج قرآن بھی غلط پڑھتے ہیں اور دین بھی نہیں سمجھتے۔ مگر فقہاء حضرات ؒ کو برا بھلا کہنے اور گالی دینے میں پیش پیش ہیں۔

خدا انگریزی تعلیم کا برا کرے کہ اس نے کھوپڑیاں ایسی بگاڑی ہیں کہ نہ دین جانتے ہیں اور نہ فطرت۔ اور جو دین و فطرت جانتے ہیں انہیں غلط بتاتے ہیں۔

آج کل ان کو ایک اور بھوت سوار ہو رہا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں ہر جگہ عید ایک ہی دن ادا کی جائے یعنی عالم اسلام کی عید اور روزہ ایک ہی دن ہوں۔ یہ تو بیوقوفی ہے۔ کیونکہ جغرافیائی فرق تو ایک فطرتی تقاضا ہے۔ آج ہم انہیں صحیح صورت بتاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ مولوی فساد پیدا کر رہے ہیں۔

دیکھو جب یہ مسئلہ واضح ہے کہ ہزار میل کے فاصلے پر طلوع و غروب میں ایک گھنٹہ کا فرق ہوگا۔ جب دو شہر شرقاً غرباً واقع ہوں تو فاصلے کے لحاظ سے سورج کو بھی وقت چاہیے۔

مثلاً پشاور اور لاہور میں خطِ مستقیم کے اعتبار سے ۲۰ منٹ کا فرق ہے۔ مگر آج ہمارا مسٹرانہ دماغ یہ کہے کہ عالم اسلام کی عید اور روزہ ایک دن ہوں کیا بیوقوفی نہیں؟

تو قرآن یہ کہتا ہے کہ ہم تو بندہ خدا ہیں۔ ہم تو صرف اسی کے حکم پر چلیں گے۔ **فمن شهد منكم الشهر فليصمه**۔ کہ جو دیکھے تم میں سے وہ روزہ کر لے۔

حدیث شریف میں بھی رویت پر مدار رکھا ہے تو چونکہ ہر آدمی رویت تو نہیں کر سکتا تو نسائی شریف میں ایک لفظ زیادہ کیا گیا کہ خود نہ دیکھ سکو تو اگر دو آدمی دیکھ لیں تو تب بھی روزہ رکھو اور روزہ کھولو۔ شرعاً روزہ رکھنے کے لیے اگر مطلع ابر آلود ہو تو ایک معتبر آدمی کی گواہی بھی کافی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ تو مشرق میں پہلے نظر آئے گا اور مغرب میں بعد میں نظر آئے گا۔

اگر مشرق والوں کو نظر نہ آئے کیونکہ غروب ہو چکا تھا اور مغرب والوں کو نظر آ جائے کیونکہ وہ وہاں بعد میں ڈوبتا ہے بس جو دیکھے وہ کر لے۔

بلغار ایک علاقہ ہے وہاں جب سورج ڈوب جاتا ہے تو چند منٹ کے بعد صبح صادق کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ تو فقہاء لکھتے ہیں کہ جس نے عشاء کی نماز کا وقت نہیں پایا اس کی چار نمازیں ہیں۔ پانچ نہیں کیونکہ وہاں وقت بھی نہیں۔

اولاد آدم ربع مسکوں یعنی دنیا کے شمالی حصہ پر آباد ہے یہ ہے پوری دنیا کہ جو خط استوا انڈونیشیا سے گزرتا ہے اس کے شمال جانب میں ۹۰ درجہ پر قطب کے قریب چھ ماہ رات اور چھ ماہ دن ہے۔ آدمی ٦٦ درجہ پر رہ سکتا ہے اگر آدمی اس سے آگے چلا جائے تو ٹھنڈ کی وجہ سے مر جائے۔ فقہاء نے درمختار اور ردالمختار میں لکھا ہے کہ یہاں نہ روزہ ہے اور نہ نماز ہے۔

مگر دوسرا قول یہ ہے کہ عام ملکوں کے وقت کی پابندی کرے روزہ اور نماز ادا کرے۔ مثلاً عام ملکوں میں دیکھے کہ رات اور دن کتنے گھنٹے کے ہیں تو چھ ماہ والے دن میں بارہ گھنٹے روزہ رکھے اور بارہ گھنٹے خوب کھائے پیئے۔ دیکھو آدمی یہاں جا تو نہیں سکتا مگر فقہاء نے (فرض) کر کے مسئلہ واضح کر دیا ہے تا کہ اگر انسان کسی مشین کے ذریعے چلا بھی جائے تو مسئلہ واضح ہو۔

مگر پتہ نہیں ان لوگوں کو کیا بیماری پڑی ہے کہ اس کوشش میں ہیں کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی عید ایک ہی دن ہو۔ کریب نے کہا کہ مجھے ام فضل نے شام کے علاقے میں بھیجا یہ ام فضل کے آزاد کردہ غلام تھے جب میں شام کے سفر سے مدینہ منورہ واپس آیا تو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے پوچھا کہ وہاں رمضان شریف کا چاند کب دیکھا گیا میں نے بتلایا فلاں دن۔ تو آپ نے فرمایا تو ہم نے ایک دن بعد دیکھا اور ہم نے ایک دن بعد روزہ رکھا۔ کریب نے کہا کہ صام معاویہؓ و صام الناس۔ کہ امیر المومنین حضرت معاویہؓ نے اور رعایا نے روزہ رکھا۔ مگر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا ہم نے جس دن دیکھا اسی دن روزہ رکھا۔ تو اس کے بعد کریب آپ سے پوچھتا ہے کہ اگر شام کے اعتبار سے تیں روزے پورے ہو جائیں تو کیا آپ عید کریں گے؟

تو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا لا نفطر حتی نراہ۔ کہ جب تک ہم چاند نہ دیکھیں روزہ افطار نہیں کریں گے۔ (حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا کہ یہ امت کا بڑا عالم اور مترجم القرآن

ہے) تو دین قانون قدرت کے مطابق ہے۔ لاتبدیل لکلمات اللّٰہ۔ اللہ کے کلمات تبدیل نہیں ہوتے۔ اس جگہ اس مسئلے کے بیان کی ضرورت تو نہ تھی مگر فراش کی شرح میں اسے بھی ذکر کردیا۔

آگے دوسرا مسئلہ جو فلسفی طریقے سے حل طلب ہے۔ وہ یہ ہے کہ بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے یا کہ بادل سے؟ تو قرآن پاک میں دونوں الفاظ ہیں۔ فتثیر سحاباً فسقناہ الی بلدمیت ۔ کہ بادل کو ہوا سے اڑا کر خشک شہر پر برساتے ہیں۔

آسمان۔ اور بادل۔ بلکہ چھت کو بھی عربی میں سماء کہا جاتا ہے۔ فلیمدد بسبب۔ اس جگہ سماء سے بالاتفاق چھت مراد لی گئی ہے۔ تو سماء بادل بھی ہوسکتا ہے۔

دوم یہ کہ اگر سماء سے آسمان مراد ہو تو یہ بھی درست ہے۔ دیکھو سائنس والے کھلے اور واضح اسباب معلوم کر سکتے ہیں۔ اور جو اسباب پوشیدہ ہیں وہ خدا تعالیٰ کو معلوم ہیں۔

دیکھو بادل اور بارش میں آسمان کو دخل ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ سورج کے شعلے سمندر سے بخارات ابھارتے ہیں جو اوپر جا کر بادل بن جاتے ہیں۔ تو اگر آسمان نہ ہوتا تو سورج بھی نہ ہوتا۔ تو بادل کہاں ہوتے۔

ایک روایت میں نقل ہے کہ بارش میں آسمان کے پانی کا بھی تعلق ہے۔ مثلاً آب زمزم میں اگر دوسرا پانی شامل کردیں تو سارا متبرک ہوجاتا ہے۔ اسی طرح بارش کے پانی میں آسمان کا پانی ڈالا جاتا ہے۔ تاکہ برکت ہوجائے۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ شاید اگر بارش میں آسمانی پانی شریک نہ ہوتا تو جتنی بھی بارشیں ہوتیں زمین سے کوئی چیز نہ اگتی۔

تیسری چیز:۔ یعنی تیسری توجیہ یہ کہ۔ چلو یہ بارش صرف بادل سے برسے۔ تو کیا یہ خود بخود برستی ہے۔ یا اسے کوئی حکم دیتا ہے۔

دیکھو بعض اوقات بادل ہوتے ہیں مگر بارش نہیں برستی۔ اور اگر برستی ہے تو پھر رکتی نہیں۔ اور پھر ہماری مرضی کی جگہ پر نہیں برستی۔ معلوم ہو گیا کہ یہ کسی کے حکم کے ماتحت ہے۔ جب تک اسے حکم نہ ملے تو یہ خود بخود نہیں برستی۔ حدیث پاک ہے کہ زمین میں جتنے کام ہوتے ہیں۔ ان کا دفتر سدرۃ المنتہی پر ہے۔ وہیں سے احکامات جاری ہوتے ہیں۔

ایک آدمی نے مجھے کہا۔ دعا کرو اللہ تعالیٰ بارش کریں۔ میں نے کہا مجھ سے نیک اور بھی ہیں۔ ان سے دعاء کراؤ۔ کیونکہ نیک آدمی کی دعاء اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں (وبشومہ) کہ جب حکمران ناانصاف اور بداعمال ہو جائیں۔ تو اللہ تعالیٰ بارش برسانا بند کر دیتا ہے۔

تو اب گورنمنٹ کو چاہیے کہ اسلامی قانون نافذ کر کے غریبوں کی امداد کرے۔

کیا اگر ایک مالک اپنے غلام کو رقم دے اور وہ اسے غلط راستہ پر برباد کر دے۔ تو وہ اسے دوبارہ رقم دے گا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اسے سزا دے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں روزی دی۔ ہم نے اس کی بے قدری کی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہم سے چھین لی۔

اسی طرح بارش بھی روزی ہے۔ کیونکہ ہر چیز اس سے وابستہ ہے۔ وجعلنا من الماء کل شیئً حی۔ ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندگی بخشی ہے۔

تو ہم نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کو غلط راستہ پر استعمال کیا تو اس لیے اللہ تعالیٰ نے بارش کی نعمت چھین لی۔
